ZINDA HOON by Hameeda Shaheen

نظمیں

حمیدہ شاہین

زِندہ ہُوں

حمیدہ شاہین

معیاری اُردُو زُبان اور
دُرُست اِملا کا محرک
اشاعتی ادارہ
MULTI MEDIA
AFFAIRS

زِندہ ہُوں: حمیدہ شاہین

ISBN:978-969-8483-95-1

اہتمام	:	رائٹرز ایسوسی ایشن لاہور
اشاعتِ اوّل	:	2010ء
ٹائٹل	:	عبدالشاہد
کمپوزنگ	:	نوید احمد
مطبع	:	علی پرنٹرز لاہور
ناشر	:	ملٹی میڈیا افیئرز
قیمت	:	250روپے

MULTI MEDIA AFFAIRS

21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54505, Pakistan. Tel: (92-042) 37356454
Mobile: 0333-4222998, 0322-4222998
Website:www.multimediaaffairs.com
E-Mail:info@multimediaaffairs.com
multimediaaffairs@hotmail.com
multimediaaffairs@gmail.com

سراج الحسن کے نام

جسے

اپنے نام کے معنی یاد رکھنے ہیں

مَیں زِندہ ہُوں

میرے پاس اُتنی ہی "مَیں" ہے، جتنی کی مجھے اِجازت دِی گئی۔

میرے پاس اُتنی ہی اَنا ہے، جس کی مجھے سہُولت مُیَسّر آئی۔

مَیں نے اُتنی زمیں لے لی جتنی میرے پیروں کی مجبوری تھی

اور

اُتنا آسماں، جتنا میرے سر کو درکار تھا

مگر مَیں اس سے زیادہ زِندہ ہُوں جس قدر مجھے زِندہ رکھنے کی خواہش کی گئی

اور ابھی مجھے اپنی بیٹیوں میں جینا ہے اور اپنی بیٹیوں کی بیٹیوں میں بھی......

جب تک ہو سکا......

جیسے ہو سکا......

☆

حمیدہ شاہین

0301-4431798

0307-7874800

قرینہ

حرفِ چند

ہُوا یہ کہ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصّے میں، اور بعد کے کچھ عرصے تک بھی، ہر کلامِ منظوم کو، جو غزل کے فارمیٹ میں نہیں تھا، "نظم" کہا گیا اور اُس پر اُن تنقیدی مفروضوں کا اطلاق کیا گیا جو گُمراہ کُن تھے۔ ترقّی پسند تحریک کے دور میں موضُوع اور ہیئت کو الگ الگ زُمروں میں بانٹ کر موضُوع، مضمون یا مرکزی خیال کو اہم تر سمجھا گیا اور زرِ نقد رکھنے والے ساہوکار موضُوع کی نشاندہی کو ہی اپنا فرضِ اوّلیں سمجھ کر اپنا سارا اثاثہ اُسی پر خرچ کرتے رہے۔ اگر ہم اُس دور کی تنقیدی تحریریں پڑھیں تو واضح ہوگا کہ حالؔی، اور اقبالؔ کی شاعری کو پرکھنے کے پیمانے نہ صِرف دُوم اور سِوم درجے کے ترقّی پسند شُعرا پر آزمائے گئے بل کہ یہی پیمانے ن۔م۔راشد، میراجی اور مجید امجد کی غیر واضح نظموں کے باب کھولنے کے لیے بھی کلیدِ کُل کے طور پر استعمال کیے گئے۔ یہ اِس بات کے باوجود ہُوا کہ میراجی نے عملی تنقید کے بہترین نمونے مُہیّا کرتے ہوئے اِس بات کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ ہیئتی عناصر یعنی امیج، علامت، استعارہ براہِ راست کسی شاعر کے سیاسی یا سماجی نظریات سے کوئی تعلّق نہیں رکھتے۔ شعری ذہن افکار و خیالات کا ممنُون نہیں ہے۔ مجھے خود یہ دیکھ کر افسوس ہُوا کہ وزیر آغا یا میری نظموں پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے کچھ احباب نے نظموں کی خارجی ساخت اور 'جسمانیت' کو کُریدتے ہوئے یہ سعی کی ہے کہ نظم کے دِل تک رسائی حاصل کرتے ہوئے شاعر کی اقدارِ حیات تک پہنچا جائے۔ یعنی اصل مقصد شاعر کے دل تک رسائی نہیں تھا بل کہ اُس کی اقدارِ حیات تک پہنچنا تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ راشدؔ، میراجؔی، مجید امجد، وزیر آغا اور دیگر کئی ہم عصر شُعرا کا کلام 'کلامِ منظوم' نہیں ہے، 'نظم' ہے، اور یہی قدرِ مشترک اُنھیں دیگر ہم عصر شُعرا سے، اگر مُمتاز نہیں تو منفرد ضرور بناتی ہے۔

مَیں حمیدہ شاہین سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہُوں۔ اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ میرے

استنبول کے قیام کے دوران مجھ تک پہنچا۔اُن کی کچھ منظومات بھی رسائل میں پڑھ کر محظوظ ہوتا رہا ہُوں اور ذہن کے کسی خانے میں یہ خیال ایک امر واقعی کے طور پر محفوظ ہو گیا ہے کہ وہ بھی اُسی قماش وقبیل کی شاعرہ ہیں جن کی شاعری پراُن پیمانوں کا اطلاق نہیں کِیا جا سکتا جو آج تک مروّج رہے ہیں اور جن کی وَجہ سے اصل اور فرع میں تمیز کرنا دُشوار ہو گیا ہے۔

حمیدہ شاہین کی منظومات کا یہ مجموعہ اُن کی شعری حسیّت پر دال ہے۔کوئی بھی شاعر جو دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتا ہے، غزل کہتے ہوئے یا نظم لکھتے ہوئے اپنی شعری حسیّت کو دو الگ الگ زُمروں میں بانٹ نہیں سکتا، تو بھی ایک سے دوسری کو پیش رفت یا مراجعت کرتے ہوئے اُسے اظہار اور اُسلُوب کی سطح پر کچھ pre-conceived notions کو فراموش کرنا پڑتا ہے اور کچھ ایک کو از سرِ نو بازیافت کرنا پڑتا ہے۔اُن میں سے ایک طرف تو اختصار وانقباض اور دوسری طرف پھیلاو اور وُسعت پذیری کے مابین ایک working relationship کا معرضِ وُجود میں آنا ہے اور دوسرا تشبیہات اور استعارات کے کینوس کو سکوڑنا یا پھیلانا ہے۔میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ حمیدہ شاہین اِس میں کامیاب رہی ہیں۔دوسرے الفاظ میں اُن کو نظم گو کے طور پر بھی اُتنا ہی اچھا کہا جا سکتا ہے جتنا کہ غزل گو کے طور پر۔

جِسم کی جِلد کی طرح ہی نظم کے خارجی خول یعنی اُسلُوب یا طرزِ بیاں کو کُریدتے ہوئے اُس کے قلبِ ماہیت تک رسائی حاصل کرنے کے طریقِ کار کے بجائے اگر ہم براہِ راست ہی موضُوعِ سمیہ تک علانیہ پہنچیں تو کسی بھی نظم کی تفسیر میں ژولیدگی یا ابہام سے بچا جا سکتا ہے۔مَیں اِس طریق کار کا اطلاق حمیدہ شاہین کی صِرف ایک نظم پر کرنا چاہتا ہُوں۔اِس نظم کا عنوان **اَلْمُدَثِّر** ہے اور یہ حضور ﷺ کا اسمِ مبارک لیے بغیر غارِ حرا میں اُس لمحے کی منظر نگاری ہے جب اُنؐ پر وحی نازل ہوئی۔منظر نامہ frame-by-frame slides کی شکل میں واضح ہوتا جاتا ہے۔

غار میں مُعتکف
اپنے کمبل کی آسُودگی بخش نرماہٹوں کے تلے
دھیان کی اوٹ میں ٹمٹماتا ہُوا پُرسکوں آدمی
یک بیک سُرخ شُعلے کی صُورت سرافراز ہونے لگا
ذرّہ بے نشاں پر اُترنے لگیں

نُور سے وصل کی ضوفشاں ساعتیں

دوسری سلائیڈ اُس سے منسلک ہوتی ہوئی اُس انسانی جسم کو، جو ایک وُجُودِ خاکی سے سُرخ شعلے کی صُورت میں بدل چکا تھا (''سرافراز''، ''ذرہ بے نشاں'' اور ''نُور سے وصل'' معنویت کا ایک خزانہ لیے ہوئے ہیں) اُٹھتے ہوئے، ''چار سُو دیکھتے ہوئے'' غار سے باہر آتا ہُوا پیش کرتی ہے۔ لیکن یہ اُس سے اگلی سلائیڈ ہے جو باہر کے منظر کو اُس ''شخص'' کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور زمان و مکان میں اُس لمحے کو اِس کمال سے پیوست کر دیتی ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ دونوں ایک نُقطۂ اِتّصال میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

اُس نے دیکھا، وہاں ہر طرف ریت ہے
ہر طرف دُھوپ ہے
کوئی سایہ نہیں، کوئی چشمہ نہیں
دُور تک کوئی نخلِ ثمر بار، کوئی گُلِستاں نہیں

ریت اور دُھوپ کی فراوانی، چھاؤں اور پانی کی غیر موجودگی، کسی بھی نخلِ ثمر بار اور گلستاں کا فُقدان...... یہ منظر نامہ بلا شُبہ اُس ریگستان کا ہے جسے جزیرہ نمائے عرب کہتے ہیں، اور جس کی طرف کوئی نام لیے بغیر شاعرہ قاری کی توجّہ مبذول کروانے کی کوشش کر رہی ہے۔

منظر نامہ مُکمّل ہو چُکا۔ اب باری ہے اس 'پیام' کی جو 'پیام بر' کو اِس تلقین کے ساتھ دیا گیا کہ وہ عوام الناس تک اُسے پہنچائے، خود سیکھ کر دوسروں کو سکھائے۔

پھر اُسے سایہ کرنا سکھایا گیا
ریت میں پھُول کیسے کھلیں گے، اُسے یہ بتایا گیا
اور اُس کے ذریعے زمانے کی تشنہ لبی کو مٹایا گیا

الفاظ کے متخصص معانی سے وضع کردہ استعاروں کے برمحل اور باموقع تقابلی استعمال سے قطع نظر، اُن کے زیریں معانی خُود بخُود ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ علامتی استعمال کے سطح پر دورِ جہالت کی مماثلت تیز دُھوپ، ریت، تشنہ لبی سے اور اسلام کے ظہور پذیر ہونے کے بعد سایہ، ریت میں پھُولوں کا کھلنا اور اُس کے ذریعے زمانے کی تشنہ لبی کا مِٹنا، یہ اِس نظم کی آخری سُطور کی بیخ و بن میں موجود ہیں اور اُنھیں تلاش کرنے میں کوئی تردّد نہیں کرنا پڑتا۔

اِس نظم کی خُوب صُورتی یہ بھی ہے کہ عنوان کے طور پر عربی کے ایک ایسے لفظ کو استعمال میں لایا گیا ہے جو ظاہراً تو ایک ایسے شخص کے لیے ہے جس نے کمبل، بوریا یا لحاف لپیٹا ہُوا ہو اور اِس لحاظ سے حضورؐ کی ذات کے لیے یہ عین واجب لفظ ہے، لیکن ایک derivative کے طور پر اُس کا براہِ راست تعلّق قرآن کے ایک سُورۃ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اِس مجموعے کے بارے میں یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اگر اِس پر شاعرہ کا نام نہ بھی ہوتا تو بھی اہلِ نظر کو پہچاننے میں دُشواری نہ ہوتی کہ یہ کلام ایک شاعرہ کا ہے، شاعر کا نہیں۔ لہجے کی نرمی، ہلکی ہلکی آگ کی تپش اور مستزاد اُس پر یہ کہ لو دیتی ہوئی، مشّع جذبات کی رو جو اپنی نسائی حدُود میں رہتے ہوئے نہ تو پوری طرح جُرأتِ بے باک میں بدلتی ہے اور نہ ہی سر پر دوپٹہ لیے ہوئے مُنہ چھپاتی پھرتی ہے، ایک شاعرہ کی شناخت کے لیے کافی ہے۔ بہ ہر حال اِس سے یہ سمجھ لینا کہ ہر اُردُو شاعرہ اپنی نسایت کے حوالے سے male-dominated مُعاشرے سے نالاں ہے اور اُس کی شاعری میں اُس مُعاشرے کی زیادتیوں کے خلاف 'احتجاج' کا ہونا ایک ضروری امر ہے، عقلِ سلیم سے دُور کی بات ہے۔ میرا اپنا مُطالعہ یہ کہتا ہے کہ گذشتہ تیس برسوں میں تبصرہ نگار قماش کے نقادوں کی یہ ایک pre-conceived notion سی بن گئی ہے کہ وہ کسی بھی شاعرہ کے کلام میں نسائیت اور اُس حوالے سے احتجاجی شاعری کے نمونے تلاش کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اپنا دل خوش کر کے اور اپنی فراخدلی کا ثبوت دے کر جیسے فخریہ لہجے میں خود سے کہتا ہے، ''دیکھا؟ مَیں نے اِس male-dominated معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنا فرضِ منصبی ادا کِیا ہے۔''

جی نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ حمیدہ شاہین کی شاعری میں ہمیں نسائی احتجاج کے نمونے ملتے ہیں لیکن اِس سے اُنھیں گذشتہ صدی کی ساٹھ اور ستّر کی دہائیوں میں اپنی آزادانہ (اور اِس حوالے سے اپنی باغیانہ) روش تلاش کرنے والی کراچی کی شاعرات کے ساتھ منسلک نہیں کِیا جا سکتا۔

اِس شاعری میں آپ ایک شاعرہ کے جذبات سے لبالب بھرے ہوئے دل کی دھڑکن تو سُن سکتے ہیں لیکن گھر گرہستی کا بکھان، آنگن میں رسّی پر لٹکے، سوکھتے ہوئے کپڑوں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ، کلکاریاں مارتے کھیلتے ہوئے بچے (جسے ایک سطح پر نسائی شاعری تسلیم کِیا گیا ہے) اور ''آدھی گواہی''، 'طلاق، طلاق، طلاق'' وغیرہ مسلم معاشرے کا اپنی نصف آبادی کے ساتھ تاریخی ناانصافی کا رونا دھونا (جسے ایک دوسری سطح پر نسائی احتجاج کی شاعری تسلیم کِیا گیا ہے)

نہیں سُن سکتے۔

اِس مجموعے میں کچھ نظمیں ضرور ایسی ہیں جو کھینچ تان کر اُس زُمرے میں لائی جا سکتی ہیں، لیکن ہم عصر ہندی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی اور برصغیر کی دیگر زبانوں کی غیر مسلم شاعرات نے بھی اِنھی موضُوعات کو اور نسائی احتجاج کے اِنھی جذبات کو اپنی شاعری میں رواج دیا ہے۔ اِس لیے حمیدہ شاہین کی ایسی نظموں کو کراچی کی اُس 'قلیل مُدّتی' تحریک سے یا صنفِ نازک کے ساتھ اسلامی معاشرے کے سلوک کی اخباری خبروں سے منسلک نہیں کِیا جا سکتا۔ اِن نظموں کی شناخت بالکل الگ ہے اور اگر ثانوی طور پر اِس شناخت کو نسائی احتجاج کی شاعری سے جوڑ بھی دیا جائے تو اُن کی شعری خصوصیات پر کوئی منفی اثر مُرتّب ہونے کا امکان نہیں ہے۔

''اک بے دھیانی'' کو ہی لیں۔ یہ ایک مختصر ترین نظم ہے جو دس سے کم سطروں میں ہی مکمّل ہو جاتی ہے۔ نظم کا واحد متکلم ''مَیں'' عورت ہے۔ کہیں مدِ مقابل 'مرد' کا ذکر سرے سے ہی نہیں، وہ باپ بھی ہو سکتا ہے، بھائی بھی، شوہر بھی اور بیٹا بھی۔ نظم میں جنسی حوالے سے ظاہراً کوئی رُوداد نہیں ہے۔ استعارہ گھر میں پکائی گئی روٹی کا ہے۔ اور امرتا پریتم کے ''مَیں ترڑ کے گھڑے دا پانی'' کی طرح گھر گرہستی، چوکے، چُولھے، آگ، توا، روٹی کی گردان میں ہمارے مُعاشرے کی گرہستن کا آرکی ٹائپ ہے۔

مَیں ٹھنڈے توے کی روٹی ہُوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
مِرے کتنے ٹکڑے اُکھڑ گئے
مَیں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
مَیں کِسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پِسنا، گُندھنا اور جلنا
بے کار گیا، مَیں ہار گئی
اِک بے دھیانی مجھے مار گئی

اس نظم میں احتجاج، سرکشی، رمیدگی بھی نہیں اور اپنی حالت سے بیخبری اور لاعلمی کی بنا پر

تسلیم، رضا اور ایجاب بھی نہیں۔ تو وہ کیا ہے جو اِس نظم کے پڑھنے کے بعد دِل میں ایک تیر سا کھُبا ہُوا رہ جاتا ہے؟ ہم سب نے اپنے معاشرے میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے دُکھوں کو دیکھا بھی ہے اور سُنا بھی ہے، اِس لیے یہ قُدرتی ہے کہ ہم اِسے نظم کی واحد متکلم کے ساتھ اپنی ذاتی اور سماجی شناخت کو جوڑ لیں لیکن اگر نظم موضوع اور مضمون پر اکتفا کرتی تو اتنی کارگر ثابت نہ ہوتی۔ اِس نظم کا حُسن اِس کی بُنت میں ہے، جو قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لیے ہوئے قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے۔ توا ٹھنڈا ہے، روٹی کو بے دھیانی سے اُس پر ڈالا گیا ہے۔ اُسے پلٹنے میں بھی نرم ہاتھوں کی احتیاط نہیں بل کہ بے دردی شامل ہے۔ ٹھنڈے توے پر وہ کیسے سینکی جاتی؟ اُس کے ٹکڑے کونے کھدروں میں بکھر گئے ہیں۔ وہ روٹیوں کی چنگیر میں اپنی جگہ تک نہ بنا سکی۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ اُس کا پِسنا، گوندھا جانا اور توے پر جلنا، سب لایعنی رہا...... نتیجہ؟ زندگی کی کشمکش میں وہ ہار گئی اور یہ سب کچھ اِس لیے ہُوا کہ وہ 'بے دھیان' تھی۔ یہ مضمون بین السطور ہے کہ اگر اُسے احساس ہوتا کہ اُس سے بُرا سلُوک کِیا جا رہا ہے، تو شاید وہ اِس جِدّوجُہد میں شکست سے دوچار نہ ہوتی۔ ٹھنڈے توّے سے لے کر چنگیر میں پہنچنے تک کے استعاراتی سفر کے سارے پڑاو کمال چابکدستی سے رقم کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ نظم نسائی حسیّت کا مظہر ہوتے ہوئے بھی جبر یہ استحصال کے خلاف احتجاج کا نعرہ بلند نہیں کرتی۔ تھکے ہوئے سے، مضمحل سے، بے چارگی کے سے انداز میں اپنی کہانی کہتے کہتے صِرف ایک لفظ 'بے دھیانی' کے تنگ و تاریک حجرے میں اپنی پناہ ڈھونڈ لیتی ہے۔

ایک اور نظم ''یقین سے باہر بکھرا ہُوا سچ'' ہے۔ یہ عنوان کانسپٹ کی سطح پر امیج کی بُنت کاری ہے۔ اِس زربافی میں دو الفاظ 'یقین' اور 'سچ' کانسپٹ کے قبیل سے ہیں، لیکن 'باہر بکھرا ہُوا' اُن کو بصری منظرنامے کا چوکھٹا فراہم کرتے ہوئے بامعنی بنا دیتا ہے۔ 'یقین' کیا ہے اور سچ کیا ہے، اِن سوالات کو تقابل و تصحیف کی لڑی میں پروئے ہوئے امیجز سے متحرک کرتے ہوئے جواب پانے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ بصری امیج پیٹرن 'نرم' اور 'کھردرے' کے تقابلی اجزا کو بہم دست و گریبان کرتے ہوئے ایک گھر کے شب خوابی کے کمرے کی داستان رقم کرتا ہے جہاں ایک 'مہکتا ہُوا ریشمی بستر' ہے لیکن اُس پر 'کانچ بکھرا ہے'۔ تکیہ بھی نرم اور ملائم ہے، لیکن اُس میں بسی ہوئی خوشبو 'کھردری' ہے۔ قرمزی پردوں پر نامانوس تحریریں ہیں، سُنہرے پھُول گُلدانوں میں سجے ہوئے ہیں لیکن اُن میں سے 'اجنبی آنکھیں' جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ نیند 'نشیلی' ہوتے ہوئے بھی خود

میں مجسم نہیں ہے، اُس کے ریزے کوڑے دانوں میں بھر گئے ہیں۔ متحرک پیکر سازی کے یہ پانچ نمونے ایک تصویر میں رنگ بھرتے ہیں جو داخلی 'یقین' پر مبنی نظم کی واحد متکلّم کی زندگی کا خارجی 'سچ' ہے۔ یہی essential self جب اسمِ متکلّم کے ضمیر 'مَیں' کی زبان سے بولتا ہے تو کچھ ایسی وارداتِ قلب کاغذ پر نُمایاں ہوتی ہے۔

مَیں کیا سوچوں
مِری سوچیں مِرے اپنے لہُو میں ڈُوب جاتی ہیں
ہے کوئی زخم ایسا جو مسلسل خُوں اُگلتا ہے
لہُو کی دھار، گرتی ہے
خیال و خواب کے اُوپر
مَیں کیا بولوں
کہ میرے لب پہ آتے لفظ چیخوں میں بدلتے ہیں
تو سینہ گُونج اُٹھتا ہے
مِرے دِل کی کراہوں سے......

آخری دو بندوں کو درونِ واوین لائے بغیر ہی نظم کو پرکھا جا سکتا ہے۔ الفاظ نہ صِرف اپنے معانی کو بل کہ اپنی اصوات میں اور بہت کچھ سمو کر ادا ہوتے ہیں۔ زنجیر کی کڑیوں کی طرح سوالات کا ایک سلسلہ ہے جو بے تابی سے اُبھرتا ہے اور جواب چاہتا ہے، لیکن سب جواب تو خود سوالوں میں ہی زخمی پرندوں کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ مَیں کیا سوچوں؟ کا جواب صِرف یہ ہوسکتا ہے کہ اگر میری سوچیں ہی میرے زخموں سے بہتے لہُو میں غوطے کھانے لگتی ہیں، تو جواب کی اُمّید کیسی۔ مَیں کیا بولوں جیسے سوال کا جواب لفظوں کے لب پر آتے ہی چیخوں میں بدل جانے کے سانحے سے مُرتّب ہے۔ مَیں سانس کیسے لوں کہ ہر سانس کے ساتھ میری پسلیوں کو کاٹتی ہوئی اِک ٹیس بدن میں پھیل جاتی ہے۔

اس نظم کے آخری چار بندوں کی امیجری شب خوابی کے کمرے کو ایک عُقُوبت خانے Horror House میں بدل دیتی ہے۔ اور تبھی عنوان اپنی پوری آب و تاب سے کانسیپٹ اور صرفی الفاظ کے مابین پُل صراط کو پوری طرح عُبُور کر کے اپنے معانی کی روشنی سب طرف بکھرا دیتا ہے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ ہجر، برہ اور بچھڑنے کا یہ جوگ وصل اور ملن کے سنجوگ کے سکّے کا ہی دوسرا رُخ ہے، تو غلط ہوگا۔ شب خوابی کے کمرے کا کوئی بھی امیج (مہکتا ریشمی بستر، مُلائم نرم تکیہ، کُھردری خُوشبُو، نشیلی نیند، قرمزی پردے، سُنہرے پھُول، گلدان) مرد کے احساسات کا مظہر نہیں بنتا۔ یہ سچ ہے کہ اِس نظم میں یا اِس جیسی کچھ دیگر نظموں میں ("آینہ"، "اِن ڈور پلانٹ"، "مرا خواب گھر"، "آمریت") مرد سے حتّی الوسع زندگی نبھانے، جینے میں مرنے اور موت کی تمنا کرتے ہوئے بھی جیے جانے کی عکّاسی کی گئی ہے اور اِس کے لیے کلاسیکی شعروادب اور ہم عصری زندگی کے علاوہ اپنے آس پاس میں بکھرے ہوئے مناظر سے بھی استعارات کا انتخاب کِیا گیا ہے۔ 'من وتُو' کے فریم آف ریفرنس میں رکھ کر اگر اِن منظومات کو دیکھیں تو اِس نتیجے تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ یہ شاعرہ بھی، دوسری کتنی ہی شاعرات کی طرح، اُس متصور و مقصود موضُوعِ فکر سے کنارہ نہیں کرتی جو مرد کو اور اِس حوالے سے بعض اوقات خود کو بھی (دیکھیے: اک بے دھیانی مجھے مار گئی) اِن حالات کا ذِمّہ دار ٹھہراتا ہے۔

حمیدہ شاہین البتہ ہمہ صفت شاعرہ ہیں اور وہ صِرف من وتُو کے دائرے کے اندر رہ کر ہی اپنی نظموں کی تخلیق نہیں کرتیں۔ اِس مالہ وماعلیہ کی جہات تعداد میں زیادہ نہیں ہیں اور شاعرہ اس کے اندر رہ کر بھی اور اِس سے باہر آ کر بھی اِس کی گوناگوں شخصی، ازدواجی اور سماجی سچائیوں کو تلاش کرتی ہیں۔ ایسے کرنے میں کہیں اِنجذاب سے یا درون بینی سے اور کہیں قیاس پر مبنی فِکر فی نفسہٖ سے وہ اِس امر کی تائید یا تردید چاہتی ہیں کہ من وتُو کی بریکٹ میں جو 'تُو' ہے، کیا وہ بھُول سے یا بے اِعتنائی سے، عادتاً بے پروائی سے، یا ایک سوچی سمجھی ہوئی بے توجّہی سے (یا مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے! کے بمصداق) اُسے اکیلا چھوڑ گیا۔

"اِن ڈور پلانٹ" میں استعارہ بہت انوکھا ہے۔ کمرے کے اندر رکھے ہوئے گملے میں سجے ایک نادر الوجود پودے کو بھی پانی اور دُھوپ کی ضرورت ہوتی ہے، آپ اُسے ڈیکوریشن بنا کر صِرف اِس لیے رکھ لیں کہ وہ آنے والوں مہمانوں کی نگاہوں میں رہے، تو وہ کُملا جائے گا، مر جائے گا۔

مِرے سائیں! ضرُوری ہے بہت دو گھونٹ پانی بھی
جڑیں پیاسی ہوں تو شاخوں پہ ہریالی نہیں رہتی

نئی کونپل نہیں آتی

دمکتے سبز پتّے زرد پڑ کر سُوکھ جاتے ہیں

سُنا ہے روشنی بھی لازمی عُنصر ہے جینے کا

اندھیرے کا تسلسُل زِندگی کو چاٹ جاتا ہے

مجھے بھی زِندہ رہنے کو ضیا درکار ہے سائیں

ہَوا درکار ہے سائیں

لفظ ''ضیا'' کی ذو معنویت سے قطع نظر اِس نظم کا ایک refrain ''سائیں'' ہے، جو شمالی برِّصغیر کی سب زبانوں (بشمولیت اردو اور پنجابی) میں 'مالک' کے معانی میں برتا جاتا ہے۔ حقیقی اور مجازی خُدا تو بہت جانا پہچانا ہُوا زباں زدِ عام کلیشے ہے، لیکن پنجابی میں تو ''سِر دا سائیں'' ایک زبان داد کلمہ ہے۔ اِس لیے یہاں یہ سمجھنے میں دِقّت پیش نہیں آتی کہ تخاطب اُسی مرد سے ہے جسے ہندی میں ''پتی پرمیشور'' کہا گیا ہے۔

''آئینہ'' میں اُس شخص سے براہِ راست کلام کِیا گیا ہے جو کسی وقت کچھ اور تھا، اور اب کچھ اور ہے۔ استعارے سامنے کے الفاظ ہیں جو جھرنے کی طرح پھُوٹتے ہیں اور اُنھیں سمجھنے کے لیے کوئی تردّد نہیں کرنا پڑتا۔

یہ پیشانی، جہاں اِک سانپ پھن پھیلائے بیٹھا ہے

مِری تقدیر کو ڈس ڈس کے نیلا کر دِیا جس نے

مِری معصُوم چاہت سے زنا کرتی ہُوئی آنکھیں......

وفا کو نوچتی نظریں

یہ عارض، جن پہ سجتی ہی نہیں تھی جُھوٹ کی سُرخی

یہی اب کِس طرح کذب و ریا سے تمتماتے ہیں

یہ وحشی ہونٹ جو میرے سکوں پر ٹُوٹ پڑتے ہیں

انھی کی سنگ باری سے مِری نازُک بدن خُوشیاں

لہُو ہوتی رہیں اب تک

اور آخری سنگِ ملامت جو کھینچ کر مارا گیا ہے، یہ ہے:

یہ خائن ہاتھ، جن کا لمس تُم نے بیچ ڈالا ہے

برائے مہربانی اُن سے چہرہ ڈھانپ لو اپنا

سُنو...... جاتے ہُوئے دروازۂ دِل بند کر جانا

''آئینہ''، ''آمریت''، ''مرا خواب گھر''، ''اِن ڈور پلانٹ''، ''یقین سے باہر بکھرا ہُوا سچ''، اور اِن جیسی درجنوں دیگر نظموں کی خالق حمیدہ شاہین کے پاس صِرف ''من وتُو'' کی شاعری نہیں ہے۔ جہاں وہ ''مری ہمراز دیواروں میں سُوئیاں کس نے گاڑی ہیں؟'' اور ''یہ خائن ہاتھ جن کا لمس تم نے بیچ ڈالا ہے'' جیسی دھڑ دھڑ کرتی، جلتی ہوئی، دھواں دیتی ہوئی سطریں لکھ سکتی ہے، وہاں وہ متنوّع سماجی رویّوں کے اِدراک سے اور اپنے اِرد گرد پھیلے ہوئے مُعاشرے سے غیر آگاہ نہیں ہے۔ بہت سی نظمیں ہیں جنھیں اُس زُمرے میں رکھا جا سکتا ہے لیکن مَیں صِرف دو نظموں کا ذِکر کروں گا۔

''ظلِّ سبحانی'' اپنی قسم کی نظم واحد ہے، جس میں گہرا طنز، استہزا سے ہوتا ہوا زہر خند حقارت کی حد کو چُھوتا ہے۔ مُغلیہ دور میں اور اُس کے بعد بھی بادشاہوں کو اللہ کا سایہ کہا گیا۔ حمیدہ شاہین سایہ یا چھانو کو اُس کے لغوی معانی میں استعمال کرتے ہوئے بادشاہ یا حاکمِ وقت کے بظاہر منادی سے مشتہر کیے گئے ایک حکم کو نظم کرتی ہیں۔

درخت کاٹو

چھتیں گرا دو

کہیں کوئی سائباں نہ چھوڑو

ہمارا پیغام دے دو سُورج کو

حکمِ ثانی تلک وُہ شب کو بھی حاضری دے

غُروب ہونے کا عیش چھوڑے

کرو منادی

کہ چھانو ممنوع ہو گئی ہے

خیال رکھّو

کہ یہ ہماری ہے راجدھانی

یہاں فقط ہو ہمارا سایہ

آمریت کے زیرِ سایہ پلنے اور بڑھنے والے ملک کے سیاسی، سماجی، مُعاشرتی حالات کے بارے میں خلق ہوئی اِس نظم کو بقول شخصے ''کاغذ کے ایک پُرزے پر تحریر کردہ پیغام کی طرح ہر کسی کی ہتھیلی پر رکھا جاسکتا ہے۔'' وہ اُسے پڑھ کر ہنسے گا بھی اور روئے گا بھی۔ ہنسے گا اِس لیے کہ اِس میں شوخ چشمی اور ٹھٹھول عوام الناس کو آسانی سے سمجھ آسکنے والی زبان میں ہے اور روئے گا اِس لیے کہ یہ کیری کیچر 'اصل' کی یاد دلاتا ہے اور یہ 'اصل' تو بقولِ خود اللہ کا نائب ہے۔

''تین سالہ بچی کا ریپ'' ایک مختلف النوع نظم ہے۔ اخباروں میں ہم ریپ کے قصّے اکثر پڑھتے ہیں، لیکن جو تاثر ہمیں اِس حسّاس شاعرہ حمیدہ شاہین کی نظم سے مِلتا ہے، وہ شاید ہم سب کے دل و دماغ میں کہیں اگر ہو بھی تو ہم اُسے زبان پر نہیں لاتے۔ مَیں نے اِس نظم کو کئی بار پڑھا ہے اور ہر بار یہی خیال دِل میں جاگزیں ہُوا ہے کہ بچوں کے ریپ کے مُقدّمات میں ہمیشہ حمیدہ شاہین جیسی ایک خاتون جج کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

دِل کرتا ہے اِس وحشی کے

سینے میں اِک خنجر ماروں

ناخُن کھینچوں......

ہاتھوں اور پیروں کی اِک اِک اُنگلی توڑوں

ہوَس کی ماری آنکھیں نوچوں اور کُتّوں کے آگے ڈالوں

ہڈّیاں توڑ کے سُرمہ کردُوں

سینہ چیروں

دِل کو ٹھوکریں مار مار کے قیمہ کردُوں

میرے بس میں ہوتا تو مَیں

اِس وحشی کے سارے جسم پہ

بال بال کی جڑ میں سُوئیاں گاڑ کے زِندہ دفن کراتی

لیکن ایسے حیوانوں کو

عدم ثبوت کا فائدہ دے کر

اکثر چھوڑ دِیا جاتا ہے

غزلوں کی طرح ہی اِن نظموں میں بھی حمیدہ شاہین کے ہاں فکری عُنصُر کی فراوانی ہے۔ رمز اور استعارے کا بر محل استعمال شعر کو حُسن بخشتا ہے اور شاعرہ کو اِس بات کا علم ہے کہ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں میں اگر دبیز ملفوفیت ہو تو وہ اپنا حُسن کھو بیٹھتی ہیں۔ حمیدہ نے ایسے گُنجلک استعاروں سے پرہیز کِیا ہے۔ اُن کے ہاں احساسِ کرب کی شِدّت بہت ملتی ہے۔ اظہار کے انتخاب میں خوش سلیقگی ہے اور مفہوم کی ادائی خوش ترکیبی سے چھپی ڈھکی ہوئی بھی ہے اور براہِ راست بھی۔ جو بات من موہ لیتی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں بھی شعریت سے عاری نثری لہجہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شعری مجموعہ پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

واشنگٹن، امریکا

تخلیقی اِمکانات کا جال

حمیدہ شاہین کی نظموں کے اِس مجموعے ''زِندہ ہُوں'' کی ورق گردانی کرتے وقت مجھے یہ علم نہ تھا کہ اُن کے اشعار کی دو کتابیں پہلے ہی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اس کتاب میں شامل کئی نظمیں مجھے پُرکشش محسوس ہوئیں اور ان کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ ان میں ایک حیران کُن سرّیت کے عناصر کی موجودگی انھیں حقیقت پسندی کی عامیانہ سطح سے اُوپر اُٹھاتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ، ان نظموں میں زندگی کی مانوس اور بیرونی سطح پر رُونُما ہونے والے تجرِبوں کا عکس بھی نمایاں ہے؛ گویا کہ وہ ایک ساتھ اپنی ہستی کے دو دائروں میں گردش کر رہی ہیں۔ پہلا دائرہ ایک ماورائی اور مابعد الطبیعاتی اساس رکھتا ہے۔ دوسرا دائرہ روزمرہ زندگی کی سچائیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ تخلیقی اظہار اور ادراک کی دُنیا میں پیچیدگی کے رنگ اسی طرح کی کشمکش کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔

اِن نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اِن میں جذبے، خیال، بیان اور اُسلوب میں کہیں بھی، اکہرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایک گہری وُجودی سطح رکھنے والی شاعری ہے اور اِس میں جا بہ جا، تخلیقی امکانات کا ایک جال سا بچھا ہُوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حمیدہ شاہین کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ اِن امکانات کی دریافت کا ہے۔ اِس مرحلے کو عُبُور کرنے کے لیے اُنھیں روایتی طرزِ احساس اور اظہار کے پیش پا افتادہ وسائل سے خود کو بچانا ہوگا۔

اُن کے شاعرانہ وُجود میں ایسی صلاحیتوں کی سرگوشی مجھے صاف سُنائی دیتی ہے اور مَیں اُس لمحے کا منتظر ہُوں جب یہ سرگوشی ایک گونج میں تبدیل ہو جائے۔ دراصل وہی لمحہ اُن کے تشخص کی تعمیر کا لمحہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک صبر آزما جستجو ہے، مگر اطمینان یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ حمیدہ شاہین اپنے آپ سے ابھی مطمئن نہیں ہوئی ہیں اور اُن کی جستجو کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی
پروفیسر ایمریطس
جامعہ مِلّیہ اِسلامیہ، دِہلی (انڈیا)

معنیٰ کی بازیافت کا خواب

حمیدہ شاہین کی یہ نظمیں اپنی تفہیم میں آسان بھی ہیں اور مُشکل بھی۔ آسان اِس لیے کہ یہ نظمیں روز مرّہ کی منطق میں اپنے مُدعا کی براہِ راست ترسیل کرتی ہیں۔ مُشکل اِس لیے کہ یہ ایک وسیع تر تناظُر میں زِندگی کے بارے میں سوچتی بھی ہیں۔ اِن نظموں میں حمیدہ شاہین اُدھ کھائے، کُترے لفظوں کے مکمّل ہونے اور روندے کچلے حرفوں کے ڈھیر سے معنیٰ کی بازیافت کا خواب دیکھتی ہے۔ وہ بہرے، گُونگے اور اندھے آج کے بنجر سے ایک زرخیز کل کے نمو کی تمنّا کرتی ہے۔

بیانیہ یا سٹیٹ منٹس یا سستی جذباتیت سے گُریز کرتی ہوئی یہ نظمیں، شاعرہ کے ذاتی غم کی گمبھیرتا سے گذر کر شعری تجربے کا رُوپ دھارتی ہیں۔ اِس اِعتبار سے ہم اِنھیں جدید طرزِ حسیّت کی نمایندہ نظمیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شاعرہ کی فِکری بالیدگی اور ہُنر پر گرِفت کا کمال ہے کہ بیشتر نظمیں اپنے اِختصار کو برقرار رکھتے ہوئے اِستعاراتی تمثیلوں اور مجرد و مفرد کی تال میل سے بنتے امیجز سے مزیّن نظر آتی ہیں۔ یہ تمثیلیں اور تمثالیں نظم کے نامیاتی تحرک کا حِصّہ بھی بنتی ہیں۔ ہر نظم کی آخری دو تین لائنیں ایک مضبُوط شعری اِستدلال کے ساتھ ساتھ شاعرہ کے سچ یا آئیڈیل کا بے ساختہ اِظہار کرتی ہیں۔ اپنی ہیئت کے اِعتبار سے بھی بیشتر نظمیں کسی شعُوری کاوش کے بغیر اپنے فطری بہاو میں مکمّل ہوتی نظر آتی ہیں۔

حمیدہ شاہین کی شاعری (جو تیسرے پڑاو پر ہے) غم کی ذاتی وارداتوں کے علاوہ اخلاقی اقدار کے اِنحطاط، موجودہ صورتِ حالات کی بے معنویت، جبر و اِستحصال، اِنسان کے نا اِنسان ہونے کے بڑھتے ہوئے عمل اور ارضِ تشکیک پر پلتی ہوئی سو طرح کی نا آسُودگیوں اور خطروں کے بارے میں ہے۔ اِس مجموعے کی آخری نظمیں عورت پر صدیوں سے روا جبر کے ظاہر و مستُور طریقِ کار کی نشاندہی کرتی ہیں اور اِس ناروا جبر کے خلاف کہیں گریہ کناں اور کہیں طنز آمیز صدائے اِحتجاج بُلند کرتی ہیں۔

آفتاب اِقبال شمیم

اِسلام آباد

بصیرت میں اضافہ کرنے والی شاعری

مجھے خرقۂ غم ودِیعت ہُوا ہے
وُہ چادر عطا کی گئی ہے کہ جس پر
چمکتا ہے ضوریز یادوں کا ابرق
جو اپنوں کی فُرقت میں رنگی ہُوئی ہے
لُہو رنگ اشکوں سے بھیگی ہُوئی ہے

حمیدہ شاہین کے نئے مجموعۂ کلام ''زندہ ہُوں'' میں موجود اِن مصرعوں کو پڑھتے ہوئے مَیں چونکا۔ میری آنکھوں کے سامنے یکایک ایک ایسی تصویر ظہور پذیر ہُوئی جس میں ایک لڑکی اپنے تمام ترغم واَلم کے ساتھ کھڑی ہوئی اپنی بے بسی پر لہُو کے اشک بہا رہی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جسے خرقۂ غم ودِیعت ہُوا ہے اور وہ ازل سے اُس کو زیبِ تن کیے تڑپ رہی ہے۔ یہ ایک تمثیلی کردار ہے جس میں ہر عورت کی تقدیر جھلکتی ہے۔

یہ تمثیل اور اِستعاروں کی عُمدگی، الفاظ اور جُملوں کی نشست و برخاست کی خُوبی ہے جس کے ذریعے نسوانی شُعُور کی جِدّت اور اِحساسات کی رنگارنگی کا جادُو ہم پر طاری ہو جاتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ اکثر و بیشتر مشرقی قوموں میں خواتین کو نچلے درجے میں جگہ مِلتی ہے۔ پہلے شوہر، پھر بچّے اور رہی سہی کچھ جگہ عورت کے لیے...... ہم مرد ذات عورت کو گھر میں ایک ''کِرم خوردہ'' مقام دیتے ہیں۔ بچی کھچی روٹی سے اُن کا پیٹ پالتے ہیں اور یہ تمنا بھی رکھتے ہیں کہ وہ زِندگی بھر اِس کے لیے ہماری مرہُونِ منّت رہے اور ہماری مہربانی کا حق ادا کیا کرے۔ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ عورت بھی اِنسان ہے، اُس کے دِل و دماغ میں بھی بے کراں سمندر مُتلاطم ہوتے ہیں اور بے شُمار طُوفان اُمڈتے ہیں بل کہ اِس طرح اُمڈتے ہیں کہ ہم اُن کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

میرے خیال میں عورت کی رُوح کو سمجھنا دُنیاے رنج واَلم کو سمجھنے کے برابر ہے، اور اُس کو تبدیل کرنے کی طرف پہلا قدم...... خیر! ہمّت چاہیے اِس قدم کے لیے اور بصیرت چاہیے اِس حقیقت کو دیکھنے کے لیے۔ اگر چہ یہی وہ خُصُوصیت ہے جس کی وَجہ سے اُردُو شاعری مجھے پسند ہے۔ حمیدہ شاہین کی شاعری بھی ایسی ہے کہ اِس کے مطالعے سے اِنسان کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن مناظر سے اکثر چشم پوشی کی جاتی ہے، حمیدہ شاہین کی نظموں میں اُس چشم پوشی سے نجات کی راہیں ہمارے سامنے کھُل

جاتی ہیں۔ وہ راہیں جن کی تلاش بہ ذاتِ خود مجھے بھی ہے، مثال کے طور پر اُن کی نظم ''گھونٹ بھرے جانے تک'' مُلاحظہ ہو:

کُتّے کے پیالے میں
دُودھ اور شہد بھی
پاک نہیں رہ سکتے
اور
جِس کی دُنیا ہی
کُتّے کا پیالہ ہو

''کُتّے کے پیالے میں دُودھ اور شہد بھی پاک نہیں رہ سکتے'' کیا اثر انگریز اور دِل دُکھانے والا جُملہ ہے اور جس کی دُنیا ہی کُتّے کا پیالہ ہو، اُس کا کیا حال ہو گا؟ یہ اور بہُت سی دوسری ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھنے سے باشعُور اِنسان کا دِل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

اُداسی گیت گاتی ہے کِسی اَنجان قریے کا،
جہاں بارش نہیں ہوتی
جہاں سایہ نہیں مِلتا
جہاں خُوشبُو نہیں ہوتی، کوئی غُنچہ نہیں کھلتا

یہ نظم اِنسانی رُوح اور نازُک خیالات کی عکّاسی کرتی ہے جس سے مجھے لگتا ہے کہ اُن کی شاعری ایک ایسی شمع ہے جو خُود جلتے ہوئے ہمیں جلا بھی دیتی ہے اور ساتھ ساتھ گرما بھی دیتی ہے۔

الغرض ایک خاتون کی نظر سے دُنیا کے رنج و اَلم کا تماشا کرنا ایک ایسا تجرِبہ ہے جِس سے ہم مرد ذات کے افراد کو بار بار گذرنا چاہیے تا کہ اِس دُنیا کو بدلنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھا سکیں جس کے پنجۂ ستم میں ہم سب پھنسے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق اَر
صدر شُعبہ اُردُو
استنبول یُونی ورسٹی، تُرکی

ابرِ کرم

اُسی اِک ذات سے پایا ہے سب کُچھ
اَماں، طاقت، تسلّی، حوصلہ، رحمت، محبت

اگر وُہ روشنی مجھ کو نہ دیتا
تو مَیں گہرے اندھیروں میں گِھری تنہا کھڑی تھی
مَیں اِک بھٹکے مُسافر سے زیادہ کُچھ نہ ہوتی

اگر وُہ تھام کے رکھتا نہ مجھ کو
مُسلسل لڑکھڑاتی اور گِرتی
مَیں خاکِ پا بنی، روندی پڑی ہوتی کہیں پر

اگر وُہ راہبر میرا نہ بنتا
نجانے کون سی راہوں میں، کِن کانٹوں پہ چلتی

وُہ میرے دِل کا رکھوالا نہ بنتا
تو مَیں غم کے سمُندر میں شِکستہ ناؤ ہوتی

وُہ اپنا نُور آنکھوں کو نہ دیتا
تو میری ہر نظر پر آنسوؤں کی دُھند ہوتی

نہ کرتا وُہ سماعت کی حفاظت
تو اِس تھّے سے دِل کو
نکیلی، برچھیوں جیسی صدائیں کاٹ دیتیں

وُہ میرے خُون میں سُرخی نہ بنتا
تو مجھ پر گہری پیلاہٹ کا موسم آ گیا تھا

وُہ ہریالی نہ بنتا
تو مَیں اپنے شجر سے ٹُوٹ کر تیکھی ہَوا کی زد میں ہوتی
نجانے کِس نگر جا کر بِکھرتی

مجھے شادابیاں دے کر ثمر آور کِیا ہے
مری شاخوں کو تن آور کِیا ہے
جڑوں پر جم کے مَیں اُس کی عنایت سے کھڑی ہُوں
اُسی نے خُشک سالی میں مجھے سیراب رکھّا
محبت کے تسلسُل سے مجھے شاداب رکھّا

☆

اَلمُدَّثِّر

غار میں مُعتکف
اپنے کمبل کی آسُودگی بخش نرماہٹوں کے تلے
دھیان کی اوٹ میں ٹمٹماتا ہُوا پُرسکوں آدمی
یک بیک سُرخ شُعلے کی صُورت سرافراز ہونے لگا
ذرّہ بے نشاں پر اُترنے لگیں
نُور سے وصل کی ضوفشاں ساعتیں
اپنی ہی لَو سے حیران
اپنی بھڑک سے ہراساں، وُہ اُٹھّا
نِکل آیا اُس بے کراں، جاوداں پل کی آغوش سے
کپکپاتا ہُوا، چار سُو دیکھتا......
اُس نے دیکھا، وہاں ہر طرف ریت ہے
ہر طرف دُھوپ ہے
کوئی سایہ نہیں، کوئی چشمہ نہیں
دُور تک کوئی نخلِ ثمر بار، کوئی گُلستاں نہیں
پھر اُسے سایہ کرنا سکھایا گیا
ریت میں پھُول کیسے کِھلیں گے، اُسے یہ بتایا گیا
اور اُس کے ذرِیعے
زمانے کی تشنہ لبی کو مِٹایا گیا

☆

خطا

سُریلے پرندے
شِکستہ پروں والے زخمی سُریلے پرندے
پڑے تھے جو شہروں کے اطراف ڈھیروں کی صورت
سُریلے پرندوں کے حلقوم تیروں سے چھلنی
مگر نغمہ خوانی کے عادی
فضا میں لہُو کی مہک ان کے نغموں سے پھیلی
تو ان کی خطا کیا

☆

اُلٹا چکّر

عجیب چکّر کوئی چلا ہے
جو شَے جہاں سے اُٹھانا چاہی
اُٹھا نہ پائے
جہاں جو رکھّا، وہاں وہ رکھّا نہیں رہا ہے
جو لکھنا چاہا، وہ لکھ نہ پائے
جو لکھّا، معنی بدل گیا ہے

تمام چکّر اُلٹ چلا ہے
جو خواب کے دائرے سے باہر تھا، اُس نے آنکھوں سے بیر رکھّا
دِل و نظر میں جسے جگہ دِی، وہ خواب بن کر بکھر گیا ہے

نصیب میں جو نہیں تھا، اُس کی تلاش میں زِندگی لگادِی
جو ہاتھ میں تھا، وہ بے خودی میں گنوادِیا ہے

جو بات کہنی تھی، اُس کی ہمّت جُٹا نہ پائے
جو لب پہ آیا، وہ حرف ہی غیر ہو گیا ہے

جو گیت ہم سُننا چاہتے تھے
کسی نے اُس کو کبھی نہ گایا ہماری خاطر
نہ تھی سماعت کو تاب جس کی
قدم قدم پر وہی سُنا ہے

کسے سُنائیں
سفر ہے کیسا
پڑاو کرنے کی کیا سزا ہے

کسے دِکھائیں
تھکن کی جھولی میں کیا پڑا ہے

کسے بتائیں
ہماری آنکھوں میں کیا رُکا ہے
جو دِل کے اندر ٹپک رہا ہے
بدن کے گنبد میں گونجتا ہے

ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں ہے
ہماری گٹھڑی میں کیا بندھا ہے
جسے اُٹھائے ہماری عمریں گذر گئی ہیں
دُعا ہے کوئی
کہ بددُعا ہے

-☆-

گِرہ کُھل رہی ہے

اُدھڑنے کا لمحہ
سروں پر لٹکتی ہُوئی تیغ ہے اب
گُماں اور حقیقت کی نیلی فضا میں
کہیں تیرتا ہے
وُہ ذرّہ سا پَل
جب ترے ذِہن و دِل پر
وُہ اِمکان اُترے
جو سب راز کھولے
تری اُنگلیاں اُس سرے کو پکڑ لیں
جہاں اِک قدیمی تسلسُل تعطُّل میں رکھا گیا ہے
تری مُضطرب اُنگلیاں ایک ہلکی سی جُنبش سے
ترتیب تبدیل کر دیں

سِرا کھینچ کر تُو
نئے ہی تسلسُل کا آغاز کر دے
وُہ دہشت جو اِمکان کی قید میں ہے
اُسے بے خیالی میں آزاد کر دے
سِرا کھینچنے اور پِتّا بنانے کی لذّت میں تُو بھُول جائے
کہ کیا کچھ اُدھڑنے لگا ہے
اِسی تانے بانے میں
تُو بھی کسی جا پرویا ہُوا ہے

☆

محبّت پر یقیں تھا جب

مَیں زِندہ ہُوں
توانائی
مِری رگ رگ میں بہتی ہے
مَیں جب چاہُوں
ذرا سا ہاتھ اُٹھا کر آسماں چھُو لُوں
فضا میں تیرتی جاؤں
صبا ہر صبح دِل کش رقص کرتی ہے مِری خاطر
شفق ہر شام سجتی ہے کہ مَیں اُس پر نظر ڈالوں
سِتارے آنکھ رکھتے ہیں مِرے ابرُو کی جُنبش پر
اِشارہ ہو تو سب کے سب مِرے آنچل پہ آ جائیں
مَیں سرگوشی کروں تو زِندگی مسحُور ہو جائے
ذرا نظریں اُٹھاؤں، وقت کی رفتار تھم جائے

مَیں ہنستی ہُوں
ہری شاخوں پہ کھلتے سُرخ پھُولوں میں
مِرے آنسُو
سُنہری طشتری میں پیش ہوتے ہیں
خُدائی بارگاہوں میں
حُضُوری کا شرف مِلتا ہے میری سب دُعاؤں کو
کبھی
محسُوس ہوتا تھا

☆

یقین سے باہر بِکھرا سچ

مہکتے ریشمی بستر پہ ٹُوٹا کانچ بِکھرا ہے
مُلائم نرم تکیے میں بسی ہے کھُردری خُوشبُو
نشیلی نیند کے ٹکڑے ہیں گُوڑے دان کی زِینت
لکھی ہیں قرمزی پردوں پہ نامانُوس تحریریں
سُنہرے پھُول دانوں میں سجی ہیں اجنبی آنکھیں
یہ سب کیسے ہُوا؟ اور کیوں ہُوا؟
کِس خواب سے پُوچھوں

مَیں کیا سوچوں
مِری سوچیں مِرے اپنے لہُو میں ڈُوب جاتی ہیں
ہے کوئی زخم ایسا جو مُسلسل خُوں اُگلتا ہے
لہُو کی دھار گِرتی ہے
خیال وخواب کے اُوپر

مَیں کیا بولوں
کہ میرے لب پہ آتے لفظ چیخوں میں بدلتے ہیں
تو سینہ گُونج اُٹھتا ہے
مِرے دِل کی کراہوں سے

مجھے یہ بھی نہیں معلوم، اب مَیں سانس کیسے لُوں
کہ میری پسلیوں کو کاٹتی اِک ٹیس اُٹھتی ہے
بدن میں پھیل جاتی ہے

مِرے پہلُو میں جو خنجر ترازُو ہے، یہ کِس کا ہے
مِری ہمراز دیواروں میں سُوئیاں کِس نے گاڑی ہیں
یہ گہری گھُور اندھیری رات کیسے صبح میں بدلوں
بتاتا کیوں نہیں کوئی
اگر مَیں نیند میں ہُوں تو جگاتا کیوں نہیں کوئی

☆

پیالے سے چھلکی ہُوئی نظم

مجھے مسلکِ چشمِ یعقُوب پر کیسے لایا گیا ہے
کسے کیا بتاؤں!
مِرا دِل تو بیعت پہ راضی نہیں تھا
مَیں جبراً ہی گریہ کے اِس سلسلے میں پرو دِی گئی ہُوں
ابھی تک گلے میں گرہ سی بندھی ہے
جو کھُلتی نہیں ہے
کھُلے تو مَیں نوحہ کروں، کھُل کے روؤں

مجھے خرقۂ غم ودِیعت ہُوا ہے
وُہ چادر عطا کی گئی ہے کہ جِس پر
چمکتا ہے ضوریز یادوں کا ابرق
جو اپنوں کی فرقت میں رنگی ہُوئی ہے
لہُو رنگ اشکوں سے بھیگی ہُوئی ہے

مجھے وُہ قلم دان سونپا گیا ہے
جسے راس ہے درد کی روشنائی
قلم اِک اذیّت میں ڈُوبا ہُوا ہے
مِرے دِل میں قبریں بنادِی گئی ہیں
مِری زِندگی کے وُہ زرخیز رقبے
جہاں موتیے اور گُلابوں کے تختے لُٹاتے تھے خُوشبُو
وہاں اب جُدائی کے کتبے لگے ہیں
محبت مجاور بنادِی گئی ہے

مجھے ہجر کی راہ پر پابہ زنجیر لایا گیا ہے
مَیں چُپ ہُوں مگر میری زنجیر کی ہر کڑی بولتی ہے
ہر اِک راہ رو سے پتا پُوچھتی ہے
کِسی سرخُوشی کا
مِری جبری بیعت پہ فتویٰ لکھے جو

☆

بَین

تجھے روتی ہُوں مَیں
تُو تھی
نئ کونپل سے بڑھ کے سبز
ہر گُل سے زیادہ سُرخ
ہر موسم سے دِل کش
اور صبح کی ہَوا سے نرم
ہر شے کی ضیا تھی تیرے اُجلے پیرہن سے کم

تجھے روتی ہُوں مَیں
تُو تھی
مِری خُوشیوں کا محور
میری قسمت کا کرشمہ
زِندگی کا کُل اثاثہ
میری قُوّت، خیر کا منبع
مِرے شر کے لیے دافع، سدا نافع

تجھے روتی ہُوں مَیں
تُو تھی

مِری مُسکان، میری جان
میری خُوش لباسی، خُوش نگاہی تیرے دم سے تھی
تُو کتنی دِل کُشا، دِل کش

مِری موہنی، مِری سوہنی

بدن میں رس
نظر میں تازگی، پاکیزگی تجھ سے

لبوں پر گیت
ان گیتوں میں شیرینی ترے دم سے
لہُو تیری ہی خاطر سُرخ، چنچل، دوڑتا، ہنستا
مِرا دِل تجھ سے زِندہ تھا

مجھے رونے دے، رونے دے
مجھے یہ بَین کرنے دے
مَیں روتی ہُوں کسے؟ مت پُوچھ!
میرے ساتھ مِل کے رو
کہ اُس کو رو رہی ہُوں مَیں
جو تیرے دِل میں زِندہ تھی

☆

اِعتبار ٹُوٹا ہے

دِل کرتا ہے
بھڑِ بھڑ بھڑکوں
مَچ مَچ ناچے شُعلہ میرا
دھرتی اُس کی آنچ سے دہکے
لاٹ فلک کا دامن پکڑے
عرش تپش کی زد میں آئے
سارا کُچھ ایندھن بن جائے

الگنیوں پر پھیلی یادیں
الماری میں رکھّی باتیں
وصل کی خُوشبُو والا تکیہ
میٹھے لفظوں والا ڈبّا

بوسوں کا لبریز کٹورا
سپنوں کی رنگین پٹاری
پھُولوں جیسے لمس کی گٹھڑی
پردوں سے لپٹی سرگوشی
چار آنکھوں سے جاگی راتیں
گملوں میں کھِلتی مُسکانیں
سارا کُچھ ایندھن بن جائے
سات سمُندر کا پانی وُہ
اپنی آنکھوں میں بھر لائے
پھِر بھی آگ نہ بُجھنے پائے

-☆-

مہکتے سُرخ پھُولوں سے لدی شاخیں کہاں ہیں اب
جو اِتنی سبز ہوتی تھیں
کہ اُن پر اِک نظر ڈالو تو دِل شاداب ہو جائے

ہَوَا!
کُچھ تو سُنا آ کر
کہ تیرا لمس کیا اب بھی کسی کو گُدگُداتا ہے؟
ترے گیتوں کو سُن کر
اب بھی کیا کوئی محبّت گُنگناتا ہے
ہَوا! کُچھ بول، کُچھ تو کہہ
بتا کِس رنگ میں رہتی ہیں خوابوں سے بھری آنکھیں
بتا اب بھی کہیں باقی ہیں ساحر، دِل کُشا نظریں
ہَوَا! کُچھ کہہ
تری لب بستگی مجھ کو ڈراتی ہے
وُہ شاخیں کیا ہُوئیں؟ کلیوں بھری بیلوں پہ کیا گزری؟
وُہ بادل اب برسنے کا قرینہ بھول بیٹھے کیا؟
سُنا ہے چُپ نہیں ہوتے پرندے موت سے پہلے
یہ اِتنی خامشی ہے کیوں؟
ہَوَا! تُو رو رہی ہے کیوں؟

-☆-

لُغت محدُود ہے

اُداسی بات کرتی ہے کسی اَنجان بولی میں
سُکُوں کا پھُول دِل کے شاخچوں سے توڑ لیتی ہے
یہ نیندوں کو اُٹھا لیتی ہے آنکھوں کے کٹوروں سے
کبھی کھوئی ہُوئی یادیں کہیں سے کھوج لاتی ہے
بہُت سی اَن کہی باتیں کہیں سے گھیر لاتی ہے
ہتھیلی پر سجا لاتی ہے وُہ سُوکھے ہُوئے پتّے
رچی ہے جِن کے ریشوں میں کوئی بھُولی ہُوئی خُوشبُو
لکھے ہیں جن پہ گذرے موسموں کے دِل نشیں لمحے
پُرانے سے پُرانا قفل پل میں کھول دیتی ہے
اُداسی جا اُترتی ہے
بدن کے اُن جزیروں پر
جنھیں ویران رکھنا ہو
اُداسی ٹمٹماتی ہے
لہُو کے اُن علاقوں میں
جنھیں تارِیک رکھنا ہو

یہ جھولی بھر کے لے آتی ہے کچھ ایسے مسائل جو
کبھی حل ہو نہیں سکتے
یہ ایسے اشک لے آتی ہے آنکھوں کے کناروں تک
جنھیں ہم رو نہیں سکتے

اُداسی اُن گمانوں میں ہمیشہ راج کرتی ہے
جنھیں ایماں نہیں ہونا
یہ اُن دُشواریوں میں جا کے اپنا گھر بناتی ہے
جنھیں آساں نہیں ہونا

اُداسی گیت گاتی ہے کِسی اَنجان قریے کا
جہاں بارش نہیں ہوتی
جہاں سایہ نہیں مِلتا
جہاں خُوشبُو نہیں ہوتی، کوئی غُنچہ نہیں کِھلتا

یہ اُن تاروں کے افسانے لکھا کرتی ہے راتوں پر
جو اپنی کہکشاؤں سے بِچھڑ کر ٹُوٹ جاتے ہیں
یہ اُن کھوئی ہُوئی راتوں کے دُکھ پر بَین کرتی ہے
جنھیں صُبحیں نہیں مِلتیں
اُداسی بات کرتی ہے کسی اَنجان بولی میں
مگر ہر لفظ دِل میں تِیر کی صُورت اُترتا ہے

☆

میرے نَجمُ السّحر

میرے نَجمُ السّحر
مَیں تری کھوج میں
رات کے مرغ زاروں میں پِھرتی رہی
جِن دریچوں تلک ہاتھ پہنچا مرا
مَیں وہاں نقرئی پھُول رکھتی رہی
دِل تِری رہ گزر میں اکیلا جلا
بارہا اِس کی لَو کو بڑھانا پڑا
بارہا اِس کی ضَو کو چھِپانا پڑا

میرے نَجمُ السّحر
کیا بتاؤں تجھے؟ اے مِرے بے خبر!
کن چراغوں میں تھے تیرگی کے بھنْور
کون سے پانیوں میں تھے کیسے شرر
تشنگی موج در موج بہتی ہُوئی
ایک مُنہ زور حیرت اُمڈتی ہُوئی
تُو مِرے ساحلوں پر نہ اُترا اگر
پار ہوگی یہ شب کون سی ناؤ پر

میرے نَجمُ السّحر
کیا بتاؤں تجھے
مَیں تِرے ہجر میں
کون سی ریت میں بیج بوتی رہی
بے بسی کی نمو کیسے ہوتی رہی
کس طرح مَیں اُداسی کا جنگل بنی
کون سی دُھوپ سیراب کرتی رہی

تیری خُوشبُو ہَوا کی زُبانی مِلی
ہر الاو میں تیری نشانی مِلی
ہر پڑاو میں تیری کہانی مِلی
پر کِسی حرف میں تُو نہیں مِل سکا
راکھ میں رنج کا پھُول ہی کھِل سکا

میرے نَجمُ السّحر
دِل بڑے صبر سے
ایک اُدھڑی ہُوئی بات بُنتا رہا
ایک ٹُوٹی ہُوئی چُپ کو چُنتا رہا
بھاگتی ساعتوں کے گھنے شور میں
تیری کھوئی ہُوئی چاپ سُنتا رہا

میرے نَجمُ السّحر
مَیں کہانی تِری
رات کو دِن چڑھے تک سُناتی رہی

اُس کہانی میں پریاں بناتی رہی
جو ترے پیار کا گیت گاتی رہیں
اور مجھے ساحروں سے بچاتی رہیں

میرے نَجمُ السّحر
کیا بتاؤں تجھے، مَیں تجھے ڈُھونڈتی
کون سے آسمانوں تلک آ گئی
کون سے ریگ زاروں سے ہوتی ہُوئی
کِن سُلگتی چٹانوں تلک آ گئی
دیکھ لے، کِن زمانوں کا وعدہ تھا تُو
اور مَیں کِن زمانوں تلک آ گئی

میرے نَجمُ السّحر
مَیں تری آس میں
ماہتابوں سے نظریں چُراتی رہی
کہکشاؤں سے پلُّو چُھڑاتی رہی
دشتِ وحشت میں خیمے لگاتی رہی
تیرے خوابوں کو اُن میں سُلاتی رہی

میرے نَجمُ السّحر
دے کہیں سے صدا
کون سے بادلوں میں بسیرا ترا
کُچھ سُنا! کِس نگر میں ہے ڈیرا ترا
دُھند کے بازُوؤں میں تُو سویا رہا

اپنی رنگین دُنیا میں کھویا رہا
کچھ بتا، کِس اُفق پر بُلاؤں تجھے
دُوریوں کا فسانہ سُناؤں تجھے

میرے نَجمُ السّحر
آ، کبھی آ کے سُن
کون سے رنگ میں طے ہُوئے فاصلے
کون سی حد پہ ٹھہرے رہے قافلے
کِن ہواؤں نے ہمّت بندھائے رکھی
کون سی دُھن میں قائم رہے حوصلے
کون سے پَل تمنّا جنوں میں ڈھلی
کِس طرح سے چلے درد کے سلسلے

میرے نَجمُ السّحر
آ، کبھی آ کے سُن
ہر نوا، ہر صدا نغمۂ ہجر ہے
جس کا ہر بول صدیوں پہ پھیلی ہُوئی
خاک ہوتی ہُوئی شام کا درد ہے
جِس کی ہر تان پَل پَل سُلگتی ہُوئی
راکھ بنتی ہُوئی رات کا درد ہے

میرے نَجمُ السّحر
اے مرے خُوش ادا
ہر یقیں، ہر گُماں سے سِوا، ماوریٰ

اِک ترا ہجر ہے
طاقچوں میں فروزاں دِیا ہجر ہے
پھیلے ہاتھوں میں روشن دُعا ہجر ہے
خُشک آنکھوں میں ٹھہرا ہُوا ہجر ہے

میرے نَجْمُ السّحر
اے مرے بے خبر!

☆

ہِندسوں کا پنجرہ

ایک سے دو تلک
فاصلہ ہے بہُت
دو سے آگے بھی اب دوڑ رُکتی نہیں
جلتے بُجھتے ہُوئے سُرخ ہِندسوں کی یلغار کا سامنا
کِس قلم سے کروں
کیا لکھوں، کیا ہُوا
کیسے ہر ذِہن اعداد کے چکّروں میں اُلجھتا گیا
کب دِلوں کی مُنڈیروں پہ جلتے ہُوئے
صبر کے سارے روشن دِیے بُجھ گئے
خواہشوں کے گھنے جنگلوں سے توکّل کے جگنو
کہاں دربدر ہو گئے
آرزُو نے قناعت سے اُنگلی چھُڑا کر کِدھر رُخ کِیا
شُکر کو قتل کر کے ہَوَس نے کہاں دفن کروا دِیا
بھُوک کا دائرہ
ہوتے ہوتے کب اِتنا کھُلا ہو گیا
اُڑتے پنچھی بھی جِس میں سمانے لگے

-☆-

دیر نہیں ہُوئی

جُدائی کا منظر
ابھی میری یادوں نے تھاما ہُوا ہے
ہتھیلی دھڑکتی ہے
پوروں میں رس دوڑتا ہے کسی زِندہ تر لمس کا

زِندگی کی مہک
پھُوٹتی ہے مری ٹہنیوں سے ابھی
میری ہریالیاں
ننھی چِڑیوں کے گیتوں سے لبریز ہیں
خواب کی تتلیاں
اُڑ رہی ہیں ابھی تیرے نقشِ قدم پر

وفاؤں کے کنگن
ابھی میری باہنوں میں موجود ہیں
ابھی مجھ کو محسوس ہوتی ہے
ماتھے پہ تیرے لبوں کی مہک، نرم حِدّت
ابھی میرے ہونٹوں پہ وُہ ذائقہ ہے
ترے ساتھ ہنستے ہُوئے جو رُکا تھا

مُسافر! فقط تیری خاطر مُسافر!
مری چھاؤں نے ہار مانی نہیں
آس ٹُوٹی نہیں ہے

☆

وعدہ

یہی زرد موسم تھا، جب تُم ملے تھے
نومبر کی خُنکی
دسمبر کی یخ بستگی کی طرف
دوڑتی جا رہی تھی
ہَواؤں میں اِک کپکپاہٹ سی تھی
اور گلے سے لپٹتی تھی اِک سرد خُوشبُو
درختوں کی پِیلاہٹیں
ٹھنڈی سڑکوں پہ بِکھری ہُوئی تھیں
یہی زرد موسم تھا، جب تُم نے مجھ سے
بہاروں کے سرسبز وعدے کیے تھے
یہی زرد موسم تھا، جب تُم نے پِیلی پڑی گھاس کو
اپنی مٹّھی میں لے کر یہ وعدہ کِیا تھا
مِرے ساتھ چلنے کا مطلب یہ ہوگا
کہ تُم زِندگی بھر گُلوں پر چلوگی
مَیں اُس دِن سے اب تک
تمھارے نشانِ قدم پر چلی ہُوں
نظر پاﺅں پر جا رُکے تو مَیں اُلجھن میں پڑ جاتی ہُوں
مِرے پاﺅں پر سُرخیاں ہیں یہ کیسی؟
اگر رنگِ گُل ہے
تو ٹِیسیں ہیں کیسی؟

☆

طلُوع سے پہلے

کبھی
یُوں ہی
کِسی شب چاندنی کا ہاتھ لگتے ہی
بِنا دستک کے کھُل جاتا ہے اِک کمرے کا دروازہ
دریچوں سے کوئی مدہوش کُن خُوشبو نکلتی ہے
فضا میں مُسکراتی ہے
ہیُولے سے کئی پردوں پہ بنتے ہیں، بگڑتے ہیں
کوئی موہُوم آہٹ پھیل جاتی ہے سماعت پر
کتابیں جاگ اُٹھتی ہیں، کوئی صفحے اُلٹتا ہے
ہوَا میں سرسراتے ہیں ادُھوری نظم کے ٹکڑے
فضا میں تیرتے ہیں ہر طرف بھٹکے ہُوئے مصرعے
کہیں مدّھم سُروں کا ساز کوئی چھیڑ دیتا ہے
اندھیرے کے سمُندر میں کوئی بجرا سا چلتا ہے
پُرانے گیت بہتے ہیں
اُداسی تال دیتی ہے
کبھی شیشوں پہ ہلکی نیل گُوں لہریں مچلتی ہیں
کِسی آواز کا سایہ کھُلی کھڑکی میں آتا ہے
کرن کوئی ذرا سا جِھلملا کر ٹُوٹ جاتی ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اندھیرے میں بکھرتا کیا ہے، کیا ترتیب پاتا ہے

☆

پیاس دائرہ بناتی ہے

ہِجر کی اوک سے
درد پیتے ہُوئے
پیاس بڑھ جاتی ہے
ہولے ہولے جڑوں تک اُتر جاتی ہے
ہر طرف اپنے خیمے لگا لیتی ہے
رُوح میں، جِسم میں
ذِہن میں، سوچ میں
نِیند میں، خواب میں
خُون میں، آنکھ میں

رُوح کے ساحلوں
جِسم کے سب جزیروں پہ بِکھری ہُوئی
ذِہن کی کھیتیوں
سوچ کے گُلستانوں میں اُگتی ہُوئی

نیند کے دوش پر
خواب کے پنکھ پھیلائے اُڑتی ہُوئی
خُون کی سُرخیوں میں ہمکتی ہُوئی
آنکھ کے آسماں پر چمکتی ہُوئی
پیاس ڈھل جاتی ہے
ہجر کی اوک میں

☆

کائنک سے آگے

تماشا گر
تری عظمت مسلّم ہے
ترے ہاتھوں میں جادُو ہے
بھری ہیں تیرے کیسے میں بہُت سی حیرتیں، جن کو
کوئی گننے لگے تو اس کو گنتی بھُول جائے گی
یہ ثابت ہو چُکا ہے، تُو
بہُت کرتب لیے پھرتا ہے اپنی بند مُٹّھی میں
تو مٹّھی کھولتا ہے جب
تو بَہ جاتی ہیں ساری منطقیں سیلِ تحیّر میں
مجھے تجھ پر
تری جادُوگری پر شک نہیں کوئی
تُو ماچس میں سے ہاتھی کو نکلتا بھی دِکھا دے گا
مجھے اِتنا بتا دے بس
کہ تیرے ہیٹ سے نکلے کبُوتر اُڑ بھی پائیں گے؟

-☆-

ساحر

ہمیشہ تُم نے اپنا آپ اپنی جیب میں رکھّا
مگر پھر بھی کُشادہ دِل، کُشادہ دست کہلائے
لُٹایا تُم نے خُود پر دُوسروں کو مُٹھّیاں بھر کے
ہمیشہ چاہنے والوں کو سِکّوں کی طرح برتا
مگر ایسے سلیقے سے
کہ خود کو صَرف کر کے بھی کسی کو غم نہیں ہوتا
تمھارا سِحر ایسا ہے
کہ جِس پر کام کر جائے
کبھی پھر کم نہیں ہوتا
تمھارا رنگ جِس پر بھی چڑھے
مدّھم نہیں ہوتا

☆

چند لمحے سہی

ایک رتھ آ رہا ہے گلی کی طرف
اُونچے، مُنہ زور، برّاق گھوڑے جُتے
جن کے نتھنے بگُولے اُڑاتے ہُوئے
جن کے چاندی سُموں کی رگڑ سے بکھرتی ہیں چنگاریاں
جن کی ٹاپوں میں دِل کو ہِلاتی دھمک
جست میں بجلیوں کی لپک
جاگ اُٹھی گلی
کھڑکیاں کُھل گئیں
سُونے دیوار و در سنسنانے لگے
ہر دریچے میں اُمّید روشن ہُوئی
سر اُٹھانے لگا کُوچۂ نیم جاں
ایک مُدّت سے تارِیک ہے آسماں

کوئی سُورج اِدھر سے گذرتا نہیں
لوگ تو اب دِیے بھی جلاتے نہیں
یُوں ہی افواہ سی پھیلتی ہے کبھی
'کوئی رتھ آ رہا ہے گلی کی طرف''
لوٹ آتے ہیں سب
زِندگی کی طرف
آنکھ کُھلتی تو ہے
آس بندھتی تو ہے

☆

وقت کا قِصاص

کتابوں میں یہ لکھا ہے
سیانے کہتے آئے ہیں
لہُو کا کھیل مت کھیلو
اِسے آغاز کر لیں تو نِکل جاتا ہے ہاتھوں سے
لہُو کی اپنی شرطیں ہیں
یہ اپنی چال چلتا ہے
بِپھر جائے تو آسانی سے رُخ موڑا نہیں کرتا
اِسے کوئی اگر اِک بار بے توقیر کر دے تو
یہ پھر اپنے سِوا کُچھ بھی کہیں چھوڑا نہیں کرتا

بڑے یہ کہتے آئے ہیں
لہُو کا داغ اَن مِٹ ہے
لہُو سے بھی نہیں دُھلتا
جو شریانوں سے بہ جائے وُہ پھر واپس نہیں ہوتا
اِسے حد میں نہ رکّھیں تو
یہ ایسے زِندگی کے گِرد گھیرا ڈال دیتا ہے
کہ پھر رستا نہیں مِلتا

تمھیں ہم نے بتایا تھا
اِسے ناحق بہاؤ گے تو یہ سر چڑھ کے بولے گا
اِسے جِتنا چھپاؤ گے، یہ سارے بھید کھولے گا
مگر تُم کو یقیں کب تھا
تمھارے گرد سب گھڑیوں کی سُوئیاں تھرتھراتی تھیں
تمھارے دِل کے ہندسے پر
اب اِس ہندسے کے باہر
دُور تک پھیلے ہُوئے ہیں قرمزی دھبّے
تُم اِس روندے ہُوئے پھیلاو میں بالکل اکیلے ہو
زمانہ تُم سے صدیوں کی مسافت پر ہے خیمہ زن
اور اِس خاکستری گھیرے سے نیلے آسمانوں تک
سزائے موت ہے
تُم ہو
مُعافی کی اپیلیں ہیں

☆

اگر کل بچانا ہے

ہماری اُترنیں ساری
جنھیں تہ کر کے رکھّا تھا
گھنے تارِیک جنگل سے پرے
اُونچے پہاڑوں میں چھپے
صندُوق جیسے
بند غاروں میں
جنھیں متروک فیشن کے لباسوں کی طرح
بنڈل بنا کے پھینک آئے تھے
گذرتی زِندگانی کی
کِسی تارِیک کھائی میں
اُنھیں یہ کیوں اُٹھا لائے

وُہ سب بوسیدہ پیکٹ
جِن پہ کائی تھی گزوں اُونچی
اُنھیں کیوں کھینچ لائے ہیں

وُہ ساری اُترنیں
جِن کی تہوں میں بِچھوؤں نے گھر بنا ڈالے
نئے طشتوں میں رکھ کر اُن کو پِھر سے کیوں سجا لائے

یہ خُوں خواری، یہ وحشت
ہم نے خُود سے نوچ ڈالی تھی
یہ کیوں پہنا رہے ہیں پِھر ہمارے دِل کے ٹکڑوں کو
ہمیں گر دِل بچانا ہے
ہمیں گر کل بچانا ہے
تو ان کو روکنا ہوگا

☆

سانپوں کا لیبر رُوم

دروازہ تو بند ہے لیکن
دروازے کے نیچے سے
اِک سُرخ لکیر
نِکلی ہے اور پھَن پھیلائے
چاروں جانب دیکھ رہی ہے

-☆-

گھُونٹ بھرے جانے تک

کُتّے کے پیالے میں
دُودھ اور شہد بھی
پاک نہیں رہ سکتے
اور
جِس کی دُنیا ہی
کُتّے کا پیالہ ہو

☆

یہاں اِک پُل بنانا ہے

سفر پہلے قدم پر ہی کٹھن ہے
جانتے تھے ہم
ہمیں چھوڑی ہُوئی پگ ڈنڈیاں اچھی نہیں لگتیں
درختوں سے بھرے جنگل میں
خودرو جھاڑیوں کو صاف کر کے
ہم نے اپنا راستہ خود ہی بنانا ہے
بس اپنے پاﺅں، آنکھیں اور دِل قابُو میں رکھنے ہیں
سفر اِک خوب صُورت تجربے میں ڈھلتا جائے گا
ہمارے ہاتھ اور کیسے کے رِشتے میں توازُن ہو
تو زادِ راہ اپنی اَن گِنت نسلوں تک آئے گا

ہمیں معلُوم تھا
ہم نے ابھی اس راستے کے دائیں بائیں
خوش نُما پھُولوں کے تختے بھی لگانے ہیں
درختوں کو گھنیری چھاﺅں پر مامُور کرنا ہے
ہماری ایڑیوں کی ضرب سے جاری ہُوئے چشمے
ہماری کھیتیوں کی سمت بہنے ہیں
ہماری اُنگلیوں سے پھُوٹتی محنت کی کِرنوں میں

سَحَر نے سانسیں لینا ہے
سُنہرا دِن نکلنا ہے۔

یہ سب کُچھ جانتے تھے ہم
مگر اِک راز
جو، اُس رَہ کا نازُک موڑ تھا
ہم نے نظر انداز کر ڈالا
کہ اپنے خون کو اپنی ہی شریانوں میں رستہ دیں
تو سڑکوں پر نہیں بہتا
جسے گھر میں ہی کوئی ہم نفس، ہم راز مِل جائے
وُہ غیروں سے نہیں کہتا
جو اپنے دِل کے ٹکڑے اپنی ہی جھولی میں رکھتے ہیں
وُہ مالا مال رہتے ہیں
جو اپنے ہر کھرے سکّے کی پُوری قدر کرتے ہیں
سدا خوشحال رہتے ہیں

یہ ایسا موڑ تھا
جِس کو نظر انداز کر کے ہم نے اپنی راہ کھوٹی کی
یہ غفلت ایک کھائی بن کے اب رستے میں آئی ہے
یہاں اِک پُل بنانا ہے
اسے اِک دُوسرے کا ہاتھ پکڑے پار کرنا ہے

۔☆۔

بڈاووں کا بھنگڑا

بڈاووں کے گھیرے میں ہالی
اکیلا
پریشاں کھڑا ہے

وُہ بھیدوں بھرے کھیت، جن کے لیے
آسمانوں سے وتّر کا تُحفہ اُترتا تھا
زرخیزیوں کی بشارت سے مہکا
تو شاخِ تمنّا پہ سرسبز و شاداب رُت گیت گاتی تھی
گُم ہو گئے ہیں

ابھی تو وُہ ہل جوتنے کے لیے
اپنے بیلوں کی جوڑی کو تھاپے لگاتا ہُوا، گیت گاتا چلا آ رہا تھا
ابھی اُس کے ہاتھوں میں جاگی نہیں تھی
ہری اور کُولی پنیری کی گُل بُل
ابھی اُس کے سینے تک آنے تھے بُوٹے
اُترنا تھا ہڈیا لے بھُورے بدن پر
ہری ریشمی گُت کتاری کا موسم
بڈاوا ابھی اُس کی بیوی کی اُترن میں سویا پڑا تھا

کہ سنولائے ہونٹوں پہ بولی کی تانیں چھناکے سے ٹوٹیں
عجیب ایک منظر بصارت پہ اُترا
کہ وتّر بھرے کھیت، جن کے لیے
بانگ ملتے ہی، سَتّی سویرے وُہ اَدھ رِڑ کا پی کر چلا تھا
بڑاووں کی بستی میں بدلے ہُوئے ہیں
یہ کیسے ہُوا ہے؟
ہراساں کھڑا خود سے وُہ پُوچھتا ہے

جہاں لحہ لحہ
نئی زِندگی کا جنم ہونے والا تھا
شب بھر میں وُہ کوکھ بنجر ہُوئی ہے
جہاں رِزق اُگنا تھا، دہشت اُگی ہے
جہاں بُوند پڑتی تو اِک دانے سے پھُوٹتیں سات بالیں
ہر اِک بال میں سو سو دانے نگاہوں کو سیراب کرتے
وہاں بھُوک عفریت بن کر کھڑی ہے
وُہ آدھے اَدُھورے ڈراوے
جو خوابوں کی کھیتی میں ایسے ہی ٹانگے ہُوئے تھے
مجسّم، مشکّل ہُوئے، ہی ہی کرتے
اِدھر سے اُدھر ناچتے پھر رہے ہیں

پریشان حالی اکیلا کھڑا ہے
وُہ بنّے پہ پتّھر کی صُورت جڑا ہے
قیامت کے اِس شور میں کیسے بولے
وُہ لوہے کے گولے

جو پیروں کی صُورت بدن سے بندھے ہیں
اُنھیں کیسے کھولے
وُہ ہڈّیالا بھُورا بدن ہر طرف اُڑتی مٹّی میں تاباں
ہری کت کتاری کا موسم بڈاووں کے گھیرے میں حیراں
کہیں دُور
اِک دیو کے خالی معدے کی گہرائی میں
لاکھوں بونے ہیں رقصاں

☆

اُونچے سُر کا کھیل

ناچ سہیلی ناچ
سہیلی یُوں دِل کھول کے ناچ
کہ گھنگھرو ٹُوٹیں
تلوے خُونم خُون ہوں
ٹانگیں کڑکڑ بولیں
تن میں بجلی چمکے
اور کمر کی چک پھیری میں گُھومے کائنات
بدن کا کُوزہ ٹُوٹے
سینہ شق ہو
دِل پنجرے سے نکلے
خاک میں لوٹے، خاک بنے
اور قصّہ ختم ہو

-☆-

کہاں سے پھیلتی ہے چُپ

ہمارا دِل
وفاؤں کا سمُندر تھا

ہمارا دِل وُہ ناؤ تھا
جسے طُوفان میں سونپا گیا نسلوں کا سرمایہ

ہمارا دِل وُہ آتش تھا
گلوں کے پیرہن میں آ کے جو چاروں طرف مہکی

ہمارا دِل وُہ چشمہ تھا
جسے زم زم کہے بِن روکنا ممکن نہ ہو پایا

ہمارا دِل وُہ خنجر تھا
جسے حلقُوم سے حلقُوم تک تھا مُعجزہ ہونا

ہمارا دِل وُہ ہجرت تھا
جُدائی نے جو بُوڑھے باپ کی بینائی پر لکھّی

ہمارا دِل وُہ عِفّت تھا
زنانِ مِصر کی آنکھوں میں حیرت بن کے جو چمکی

اِسی دِل کے لیے ہٹ کر
رواں دریا نے بیچوں بیچ اِک رستا بنایا تھا

وُہ زِندہ رُوح تھا یہ دِل
بِاِذنِ اللّٰہ جو مُردوں میں اُتری زِندگی بن کر

یہ اُن لمحوں کا محرم تھا
رہیں گے تا ابد روشن جو اِقراٗ کی شُعاعوں سے

ہمارا دِل وُہ غنچہ تھا
جو کِھل اُٹھتا تو خُوشبُو صُورِ اِسرافیل تک جاتی

مگر
چُپ ہے
یہی دِل اب

☆

وُہ بات پھیل چکی

اُتر رہا تھا درختوں پہ خوف کا موسم
اُمڈ رہے تھے کہیں سے ہراس کے بادل
کُلھاڑیوں کی چمک تھی سروں پہ چھائی ہُوئی
جڑوں پہ جم کے کھڑے پیڑ پر مہکتے ہُوئے
تمھاری سانس کو پہچانتے، ٹھٹکتے ہُوئے

جو بات یاد بنی

بھری بہار کے اِک شوخ گیت میں کھوئی
گُل و ثمر کے رسیلے خُمار میں ڈُوبی
لچکتی جُھومتی شاداب شاخ کٹ کے گِری
تو گھونسلوں کے اُجڑنے کا درد سہتے ہُوئے
تمھارے وار کو پہچانتے، سسکتے ہُوئے

جو بات اشک بنی

ہرے شجر سے بچھڑ کر زمیں پہ آتے ہُوئے
ہَوا کی مُٹھی میں دم روکے، چُرمراتے ہُوئے
بدلتے رنگ کی دِل چِیرتی اذیّت میں
شجر سے پھُوٹتی کونپل سے خاک ہونے تک
تمھارے لمس کو پہچانتے، بکھرتے ہُوئے

جو بات رنج بنی

تمھارے دامن و دستار تک رسائی میں
جو ہاتھ کاٹے گئے، اُن پہ بَین کرتے ہُوئے
تمھارے چہرے کو پہچاننے کی کوشش میں
جو آنکھ روندی گئی، اُس کے اشک روتے ہُوئے
خود اپنے آپ سے دیوانہ وار لڑتے ہوئے

جو بات درد بنی

وُہ اُگ رہی ہے کڑے صبر کی زمینوں پر
وُہ پھلنا سیکھ رہی ہے بُریدہ شاخوں پر
مہک رہی ہے وُہ کُچلے ہُوئے شگوفوں میں
کہاں کہاں سے اُسے اِس طرح اُجاڑو گے
دِلوں سے اُس کی جڑیں کِس طرح اُکھاڑو گے

وُہ بات پھیل چکی

☆

رَبِّ اَرِنی

زمیں کی تہوں سے کُھلے آسماں تک
کسیلا دُھواں ہے
ہیُولے ہیں، پرچھائیاں ہیں، گُماں ہے
توہّم کی گہری سیہ وادیاں ہیں
سوالات کا سُرمئی سِلسلہ ہے
تذبذب کا مٹیالا دریا رواں ہے
ہر اِک سمت اِک زرد رُو بے یقینی کا گہرا تسلُّط ہے
دِلِ بے اماں ہے
پکڑ میں نہ آتا ہُوا آسماں ہے
سمجھ میں نہ آتی ہُوئی داستاں ہے
مِرے واسطے جو سجائی گئی تھی
وُہ دُنیا کہاں ہے؟

☆

نقاب

سُرخ کیے بے داغ کبوتر
مار گرائیں
ممٹی پر آ بیٹھی چڑیاں
ڈانٹ بھگایا
ڈال پہ بیٹھا ہریل توتا
ہر جانب سناٹا کر کے
جائے نماز پہ آ بیٹھا ہے

☆

دیارِ سنگ

سیہ راتیں
سروں میں راکھ ڈالے
سروقد، بازُو اُٹھائے، بَین کرتی ہیں
اِنھیں کیسے تسلّی دُوں؟
لہُو روتی ہُوئی شاموں نے دِل کو گھیر رکھا ہے
نظر کو باندھ رکھا ہے
سوالوں سے بھری سُوجی ہُوئی آنکھوں نے اِک زنجیرِ گریہ میں
جو ڈھیلی بھی نہیں پڑتی
وُہ گہری دُھند ہے جس میں دِکھائی کُچھ نہیں دیتا
جو رستا ہی نہیں دیتی

تپا رہتا ہے ماتھا زِندگی کا اِس طرح، جیسے
دہکتے کوئلوں سے آتشیں لہریں نکلتی ہیں
مسیحا لمس کی خُنکی نصیبوں میں نہیں لکھّی

رگوں میں کُچھ سُلگتا ہے
لہُو سے آنچ اُٹھتی ہے

کوئی چشمہ، کوئی دریا مری رَہ میں نہیں پڑتا

پڑی ہیں ریتلے سینے میں کتنی بے کفن لاشیں
مَیں اپنے ناخنوں سے کیسے پتھریلی زمیں کھودُوں؟
کہ میرے ہاتھ تو شل ہیں
نجانے کتنی صدیوں سے یُونہی مصروفِ ماتم ہیں

ورم آلُود، زخمی اُنگلیاں، کِس کو دِکھاؤں مَیں؟
کہ چاروں کھونٹ پھُونکا جا چُکا وُہ اِسم، جس نے
چھِین لیں بینائیاں سب کی
ستُونوں میں بدل ڈالا ہے میرے غم گُساروں کو
مَیں سر ٹکرا رہی ہُوں، رو رہی ہُوں، بَین کرتی ہُوں
وُہ جُنبش بھی نہیں کرتے

☆

کالے دِن کا گھیرا

تالی پیٹنے والے دِن سے بچ کر چلنا
ورنہ تیرے آنے والے کل کی زرخیزی پر
سب کو شک گذرے گا

اِس دِن میں وُہ پَل بھی ہے، جو کانٹے چُن کر
گھر کو جانے والے رستوں پر رکھتا ہے
وُہ ترغیب کا لمحہ، جس میں
سونا، چاندی، ہیرے، موتی، دِل بہلانے والے ساتھی
وُہ ساعت، جو رِ گرہوں میں پڑھ پڑھ کے پھُونکتی
گلیوں میں پیچھے پھِرتی ہے
وُہ پَل بھی جو مُستقبل کے بانجھ پنے کا طعنہ بن کر
دروازے پر آن کھڑے ہیں
آنے والے کل کی زرخیزی کی خاطر
اِس دِن کے بنجر سے بچنا

ایسا کون ہے
جو اِس کالے دِن میں تیرے ساتھ چلے گا

کِس میں اِتنا دم ہے جو پیچھے ٹھہرے گا
اب اِس دِن کی ہمّت اِتنی بڑھی ہُوئی ہے
اِک اِک غار میں جھانکے گا یہ
مکڑی بھی کب
ایک ہی کام دوبارہ کرنے آ سکتی ہے

اب اِس دِن کا گھیرا بڑھتا ہی جائے گا
اِس گھیرے کو توڑنا ہوگا
آگے جانا ہے تو پیچھے کی ہر شے کو چھوڑنا ہوگا

اِمکانات کا ایک ہجُوم ہے
اور گُمانوں کا لشکر ہے چاروں جانب
جِس میں تیرا اشرف ہونا ایک یقیں ہے
اِسی یقین کی گردش تیرے روز و شب سیراب کرے گی
بنجر کو شاداب کرے گی

☆

حاضر غائب

اشارہ کِس نے توڑا ہے
کہ چوراہے کے بیچوں بیچ
ہم اِک دُوسرے سے اِس طرح ٹکرا گئے ہیں

یہ چاروں راستے
ہم نے محبت کی کُدالوں سے تراشے تھے
ہمیں پھُولوں پہ چلنے کا اشارہ چاہیے تھا
مگر رِشتوں کے بادَل، جو کبھی دِل پر برستے تھے
تو ہریالی کا موسم چاروں جانب پھیل جاتا تھا
وُہ بادل کانچ کے مانند یُوں ٹُوٹے فضاؤں میں
کہ ہر رستا نکیلی کِرچیوں کی سُرمئی بارش میں بِھیگا ہے

یہ چوراہا
کہ جو اپنے مِلن کا اِستعارہ تھا
تماشا گاہ میں بدلا

مُسافر ایک دُوجے کے مقابل آ ہی جاتے ہیں
مگر اپنا سفر کیسے تصادُم میں ڈھلا آخِر؟
اِسے اِک حادثے کی شکل کیسے اور کِس نے دِی؟

سفر کو سانحے کا پیرہن پہنا کے
چوراہے کے بیچوں بیچ اِستادہ کِیا جس نے
اُسے ہم کِس طرح ڈُھونڈیں
اُسے ہم کیسے پہچانیں
کہ ہر سُو خُوش نُما چہرے کچُومر ہو کے بِکھرے ہیں
وُہ ملغُوبہ، جو اِس اندھے تصادُم کا نتیجہ ہے
اُسے کِس شکل میں ڈھالیں؟

-☆-

نہ جانے کب لکھا جائے

تحیّر کی فضاؤں میں
کوئی ایسا پرندہ ہے
جو پکڑائی نہیں دیتا

ہے کوئی خواب ایسا بھی
ازل سے ہے جو اَن دیکھا

کوئی ایسی صدا بھی ہے
سماعت سے ورا ہے جو

بصارت کی حدوں سے دُور اک منظر ہے جواب تک
تصوُّر میں نہیں آیا

کہیں کچھ ہے
جو اِک پل دِل میں آ ٹھہرے
تو جِسم و جان کے ہونے کا اِک بیّن حوالہ ہو

جو گیتوں میں اُتر آئے
تو اِس دھرتی سے نیلے آسماں تک وجد طاری ہو

جو لفظوں میں رچے تو بات پھُولوں کی طرح مہکے
اگر لمحوں میں دھڑکے تو زمانوں میں صدا پھیلے
اگر منظر کے اندر ہو
تو بینائی کو اپنا حق ادا کرنے کی جلدی ہو

وہ شاید ہے
اِک ایسی داستاں، جو رُوح کے اندر ہے پوشیدہ
اِک ایسی سانس، جو سینے کی تہ میں چھپ کے سوئی ہے
اِک ایسا چاند، جو افلاک سے باہر چمکتا ہے

مُقدّر ہی بدل جائے
اُسے گر لِکھ دِیا جائے
ہمارے درمیاں ہونا

☆

کہانی

سویرے اُٹھ کر
مَیں اپنی بے خواب شب کا غُصّہ اُتاروں تُم پر
پراٹھا تلتے ہُوئے مرے ہاتھ پر ،گرے گرم گھی کا چھینٹا
تو تِلملا کر کہوں کہ یہ ہے
تمھارے چہرے پہ پڑنے والی نگاہِ اوّل کا شاخسانہ
جو سُوٹ پہنوں، وہ فِٹ نہ آئے
اور اُس کے میچنگ کڑے بھی ہاتھوں کو چھیلتے ہوں
تو بُڑ بڑا کر مَیں پانْو پٹخوں
کہوں کہ اِس گھر میں ہے نحوست
جہاں پہ پھُوٹی ہے میری قسمت
پہن کے سینڈل مَیں اُتروں زینے
تو اُونچی ایڑی ذرا سی پھسلے
سنبھل کے مَیں تُم پہ ایک ایسی نگاہ ڈالوں
جو کہہ رہی ہو
کہ ’’سب تمھارا کِیا دھرا ہے‘‘
جو گھر سے نکلوں

تو گیٹ یُوں بند کر کے جاؤں
کہ بم دھماکے کا شائبہ ہو
پلٹ کے آؤں تو
تنتنائے ہُوئے مَیں سر سے اُتاروں چادر
اور اُس کا گولا بنا کے سوفے پہ ایسے پھینکوں
کہ گویا گھر آ کے مَیں نے سب پر
عظیم اِحسان کر دیا ہے
یہ سب اگر ہو.............

مگر یہ، کردار
اِس کہانی میں یُوں نہیں ہے

☆

مٹّی کا اِجتہاد

پرندہ نیا ہے
اِسے اِس شجر سے اُڑا دے مری جاں
یہاں شاخ در شاخ
اُجڑے ہُوئے گھونسلوں
اور نوچے کھسوٹے ہُوئے پھُول پتّوں کی صُورت
گُذشتہ بہاروں کا ترکہ پڑا ہے
شجر ایک مدّت سے پیاسا کھڑا ہے
اب اس کی جڑوں میں لہُو کے سِوا بھی کبھی کچھ رچے گا؟
جہاں زخم کِھلتے ہوں
اُن شاخچوں پر مُغنّی پرندہ بھلا کیا جچے گا

یہ سپنا نیا ہے
اِن آنکھوں سے اِس کو اُٹھا لے مری جاں
جنھیں اپنی نیندوں کے معنی بدلنے کی فرصت نہیں ہے
یہ سوئے ہُوئے نیم مُردہ تخیّل
جنھیں ایک کروٹ کی ہمّت نہیں ہے
نئے خواب کی کیا حفاظت کریں گے

یہ موسم نیا ہے
اسے اس گُلستاں کا رستہ دِکھا دے

جہاں کیاریاں منتظر ہیں کہ اِن میں
نئے بیج بوئے گا کوئی کبھی تو
نئی کونپلیں سر اُٹھانے لگیں گی
تو بدلے گا سارے گُلستاں کا منظر

ازل ہی سے مٹّی کا پیغام ہے یہ
ڈھلے کوئی صُورت، بنے کوئی پیکر

پرندہ ہو، سپنا ہو، یا سبز موسم

☆

چوری کی بھُوک

سُن !
مجھے تیرے لقمے کی
تھالی کی
حرص وہوس کی قسم !

یہ مرا رزق تھا
ذائقہ جس کا تیری زُباں نے چکھا

کیا بتاؤں تجھے
مَیں کڑکتی ہُوئی دُھوپ میں پابرہنہ کہاں تک چلی،
مَیں نے کتنے کڑے کوس کاٹے تو دو گھُونٹ پانی مِلا

کیسے میرا لہُو
پانی ہو کے مساموں سے بہتا رہا،
اور مَیں ڈھوتی رہی رنج کی گٹھڑیاں

کیا کہوں
کِس مُشقّت نے ہاتھوں کو زخم اور پیروں کو چھالوں کا تُحفہ دِیا
یہ مری محنتوں کی کمائی تھی،
جو تیری تھالی میں ہے

سُن!
مجھے میری فاقہ کشی کی قسم!

-☆-

بِالآخِر

کھول کر دیکھ لو
زِندگی سے یہ گٹھڑی اُتارو
اِسے کھول کر دیکھ لو
اِس میں کُہنی سے کاٹے ہُوئے ہاتھ ہیں
ایک ہی ہتھکڑی میں پروئے ہُوئے
اور اپنی لکیروں کو کھوئے ہُوئے

اِس میں آنکھیں ہیں
جو بُجھ گئیں اور اُن میں پڑے رہ گئے
خواب ٹُوٹے ہُوئے، اشک روئے ہُوئے

ایک چُر مُر کیلنڈر رہے
جِس میں کوئی رات معراج تھی
کوئی دِن عید کا

اس میں کچھ دھجّیاں ہیں
جو رنگین آنچل تھیں اُمّید کا

زندگی سے یہ گٹھڑی اُتار دو
اِسے کھول کر دیکھ لو
اور پھر باندھ دو

-☆-

بتّی سُرخ ہے

آوازوں کا لشکر، سر پر
خیمے گاڑ کے بیٹھ گیا ہے
ہر شیشے پر
کالی دُھند کی موٹی تہ ہے
چِیل کے پنجوں جیسے بھدّے بھدّے منظر
بِینائی کو نوچ رہے ہیں
جِن موسم کی بارش سے سڑکیں بھیگی ہیں
جِن کو سبز اشارے کی توقیر مِلی ہے
وُہ بندُوق سے چُھوٹی گولی کی رفتار سے بھاگ رہے ہیں
سب اپنے اہداف کی جانب
سانس دُھویں میں لت پت سب کی
اِک دُوجے سے
آگے جانے کی بے چینی میں سب خود کو روند رہے ہیں

دائیں بائیں
شائیں شائیں کا تیکھے دندانوں والا رندہ
دِل کی گیلی لکڑی چِھیل رہا ہے
جان ہے خوف کی آری نیچے

جانے کتنے جیون بتّی سُرخ رہے گی
کِھڑکی پر دستک تو ہوگی
کِھڑکی کھول کے نقلی پھُول خرید نہ لینا
سبز اشارے کے روشن ہونے سے پہلے
کوئی پھُول خرید نہ لینا

-☆-

موت کا پھندا

آنکھوں کو میچے
بانہیں اُٹھائے
دہکے ہُوئے رُخ پہ گیسو گِرائے
عُنّابی ہونٹوں پہ اِک آتشیں مُسکراہٹ سجائے
ہاتھوں کی جُنبش سے طُوفان اُٹھاتی
پوروں کے اِک اِک اشارے سے ہر سمت بجلی گِراتی
نیلی فضاؤں میں لہریں بناتی
ناچے چلی جارہی ہے چھنا چھن

بستی کے بیٹے
حلقہ بنائے
تالی بجاتے
اس ساحرہ کی تعریف و توصیف میں گیت گاتے
مستی میں ہیں اُس کے ہم راہ رقصاں
جِن میں نہیں ہے یہ دم خم کہ ناچیں
وُہ مبہُوت ہو کر
اُنھیں تک رہے ہیں

رقصاں بدن
دائروں کے طِلسمی جہاں میں گھُماتا
جانے کِدھر کو لیے جارہا ہے

بستی کے بُوڑھے
پیرانہ سالی کی ناطاقتی کو بہانہ بنائے
سوئے پڑے ہیں
کوئی نہیں ہے جو یہ رقص روکے
بستی کے بیٹوں کو
جادُو کے اِس کھیل سے کھینچ لائے

☆

ظِلِّ سُبحانی

درخت کاٹو
چھتیں گرادو
کہیں کوئی سائباں نہ چھوڑو
ہمارا پیغام دے دو سُورج کو
حُکمِ ثانی تلک وُہ شب کو بھی حاضری دے
غُرُوب ہونے کا عیش چھوڑے

کرو منادی
کہ چھاؤں ممنُوع ہوگئی ہے

خیال رکھّو
کہ یہ ہماری ہے راج دھانی
یہاں فقط ہو
ہمارا سایہ

☆

چھٹی حِس

زمیں اوپری اوپری لگ رہی ہے
فلک پر جو مانُوس تارے چمکتے تھے، جانے کہاں ہیں
ہَوا میں کوئی ایسی خُوشبُو رچی ہے، جو دِل چیرتی ہے
فضاؤں میں کڑواہٹیں سی گھُلی ہیں
وُہ تشنہ لبی ہے
کہ حلق اور زُباں سے لہُو رِس رہا ہے
کہیں دُور سے بَین کرنے کی آواز بہتی چلی آ رہی ہے
کبھی ایسا لگتا ہے، پیروں تلے خاک بے چین ہے
کبھی دھوکا ہوتا ہے، کوئی شجر سِسکیاں لے رہا ہے
کبھی یہ توہّم، پرندے چہکتے نہیں، رو رہے ہیں
نجانے یہ کیا ہے
کہیں کُچھ ہُوا ہے
یا...... ہونے لگا ہے

☆

کہیں بِین بج رہی ہے

ہر سمت کوڑیالے
زہریلے پھن اُٹھائے
لمبی زُباں نکالے
لہراتے پھِر رہے ہیں
گلیوں میں ، آنگنوں میں
راہوں میں ، محفلوں میں
پھُنکار گُونجتی ہے
ہر سُو ہیں سُرخ آنکھیں
کالی سیاہ دہشت
بے نام سی نحُوست
پیروں میں رِینگتی ہے
فصلوں میں پھِر رہی ہے
پھُولوں پھلوں کے رس کو
زہراب کر رہی ہے
یہ زہر آگیں خلقت
اندھے بِلوں سے باہر
کیسے اُمڈ رہی ہے
کہیں بِین بج رہی ہے ؟

☆

شب خُون

تمھاری نیند کو دلدل بنانے کا عمل
کُچھ یُوں ہُوا آغاز
اِک موہُوم نُقطے سے
کہ اپنی خواب گاہوں کی حفاظت کر نہ پائے تُم
سرہانے آن پہنچا
یُوں بِنا آہٹ، بِنا دستک
وُہ سیلِ تُند رَو
آنکھیں بہا کر لے گیا ہے جو
بچا ہے چار سُو کیچڑ
کہ جِس میں کیچوے ہوتے ہیں سرمستی میں بار آور
وُہ سارے دِل
جنھیں ہم نے محبت کی سُنہری لہر سے لبریز کرنا تھا
بساندے، بجبجاتے خوف سے مُنہ تک بھرے ہیں وُہ
تمھیں بھی نرم بستر کے سِوا کُچھ سُوجھتا کب تھا
اسی بِستر کی ہر سِلوٹ بغاوت پر اُتر آئی
نِگل جائے نہ آنکھوں کو
یہ گہری نیند کی دلدل

-☆-

بہرا، گُونگا، اندھا آج

وحشت میں گُم جنگل کے اُس پار کھنڈر میں
دِیواروں سے لپٹی ہیں اَدھ موئی تانیں
کائی زدہ تالابوں میں ڈُوبے ہیں نغمے
ہر کھڑکی پر لہراتی ہے ایک کہانی
میٹھے کومل سُر درزوں میں چھپے ہُوئے ہیں
دروازے پر آنکھوں کی دستک چپکی ہے۔

ملبے میں اَدھ کھائے، سیلے، کُترے، اُگلے لفظ دبے ہیں
روندے، کُچلے حرفوں کی چیخیں، فریادیں
بے معنی آوازوں کا اِک ملغوبہ ہیں
مُردہ باتوں کا اِک اُونچا ڈھیر لگا ہے۔

تارِیکی نگلے بیٹھی ہے سارے سُورج، چاند، سِتارے
اُجلے منظر اس کی کالی بُکّل میں ہیں
روشن آنکھیں مُٹھی میں بھینچے پھرتی ہے
جگمگ سوچ کو ڈھانپ رکھا ہے اپنی بوسیدہ چادر میں

بہرے، گُونگے، اَندھے آج کے
ملبے سے سب لفظ برآمد کر کے لاؤ
کھنڈروں سے ساری کومل آوازیں چُن لو
تارِیکی سے چھینوا پنے اُجلے منظر، روشن آنکھیں
اُن کی خاطر
جِن کے اُوپر آنے والا کل اُترے گا۔

آنے والے کل کی راہ بنانے والے
جان بہ لب لفظوں کو سانسیں دینے والے
ٹُوٹی پھُوٹی آوازوں کو اپنے دِل میں بونے والے
اُن کی سیرابی میں اپنا خُون، پسینا، آنسُو دریا کرنے والے
مَیلے منظر دھو کر اُجلے کل پر چسپاں کرنے والے
نئی لکیریں کھینچنے والے
تازہ رنگ سجانے والے
صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ آج کے پیغمبر ہیں

جب اَدھ کھائے، کُترے لفظ مُکمّل ہوں گے
جب آوازیں کونپل، پتّے، پھُول بنیں گی
منظر ہنسنے بولنے گانے لگ جائیں گے
تب اس آج پہ دِین مُکمّل ہو جائے گا
آج کے سب پیغمبر کل معراج پہ ہوں گے۔

-☆-

پرائے موسم کا سُود

بس اِک برق لہرائی، کڑکی، ِگری
اور سرسبز فصلیں بھسم کر گئی ہے۔
تجھے موسموں کی شناسائی کا زعم ہے
کُچھ بتا اب
یہ کالے، جلے ٹُھنٹھ
ِکن بارشوں، ِکن ہَواؤں کو پہچان پائیں گے اب
یہ سُلگتی ہُوئی راکھ
زرخیز مٹّی کا نعم البدل کیسے بن پائے گی اب
بدھائی! کہ بنجر ہُوئی تیری کھیتی
بدھائی! کہ تُو جوتنے کی مسلسل مُشقّت سے چھُوٹا

☆

مائیں بُوڑھی ہونا بھُول چُکی ہیں

اُونچی پیڑھی پر بیٹھی
برتاوا کرتی
چوکس آنکھیں
ہوکے جیسی بھُوک سے لڑتی
روٹی توڑتے ہاتھوں کو تہذیب سِکھاتی
چسکے لیتی جیبھوں کو اِک حد میں رکھتی
پیاس بُجھانے کے آداب بتاتی آنکھیں

باچھوں سے بہتی خواہش کو پُونچھنے والی
نظروں میں ہلکورے لیتے لالچ کو چِمٹے میں بھر کے
جلتی آگ میں جھونکنے والی
ننھّے ہاتھوں سے چِپکی چھینا جھپٹی کو
ممتا کے پانی سے دھونے والی آنکھیں
کِس کاجَل کو پیاری ہو گئیں
بچّے مِل کر کھانا پینا بھُول گئے ہیں۔

-☆-

ذوقِ جمال

کرخت چہرہ
دُرشت آنکھیں
کٹیلی، برفیلی، نخوت آمیز تُند نظریں
لبوں کے گوشوں پہ طنز کا آتشیں کھچاو
نقُوش میں ایک سرد سختی بھری کساوٹ
عجیب سا اِک غرُور گردن کے ترچھے پن میں
بدن کا ہر زاویہ تکبّر کا اِستعارہ
ہمیشہ ہاتھوں میں خنجرِ آب دار تھامے
ہمیشہ چوکس
کہ جیسے پل میں جھپٹ پڑے گی
اُڑا کے رکھ دے گی راستے کی ہر ایک شے کو
دِلوں پہ چلتی
حسین پھُولوں کو روندتی
جانے کتنی صدیوں سے
کِس طرف کو رواں دواں ہے
یہ زِندگی ہے
یہ وحشی ڈائن
تمھیں ہمیشہ حسیں لگی ہے
مجھے کبھی اپنی آنکھیں تُم مستعار دینا

-☆-

نا اِنسان

ہر طرف سے اُمڈتے، یہ لاکھوں بدن
کالے چوغوں میں ملبوس، دہکے ہُوئے سُرخ چہرے لیے
ہاتھ یُوں اینٹھتے ہیں
کہ جیسے فلک نوچ لیں گے ابھی
اپنی خونی رجز خوانیوں سے
سماعت کو نوکِ سناں پر اُٹھائے ہوئے
زِندگی کا سُنہرا بدن روندتے
ایسے چلتے ہیں
جیسے زمیں چیر دینے پہ رکھتے ہیں قُدرت
نحوست زدہ
گاڑھی وحشت میں لِتھڑے ہُوئے بدقدم
اُجلی صبحوں پہ چھینٹے اُڑاتے ہُوئے
سانْولی شام کی اوڑھنی کھینچ کر
اپنے نیزوں کو پرچم بناتے ہُوئے
کون ہیں یہ؟
کہاں سے اُمڈ آئے ہیں؟

☆

رُکا ہُوا منظر

یہ پُرسکُون وادیاں
ہرے شجر، سفید پھُول، کِھلکھلاتی تِتلیاں
یہ جھاگ اُڑاتے پانیوں میں چمچماتی مچھلیاں
قطار میں بنے مکاں
دُھواں اُگلتی چمنیاں
پھلوں کی دِل رُبا مہک فضاؤں میں رچی ہُوئی
یہاں وہاں کھڑی ہیں بھیڑیں اُون سے لدی ہُوئی
دبیز دُھند میں سے آفتاب جھانکتا ہُوا
تُند و تیز، یخ ہَوا
شگُوفے ڈالیوں پہ جِھلملا رہے ہیں دُھوپ میں
پگھل رہی ہے برف جیسے بہہ رہی ہو روشنی
سروں پہ گاگریں لیے پہاڑنوں کی ٹولیاں
عقب میں جگمگا رہی ہیں سر بُلند چوٹیاں
بُلند چوٹیوں کی اوٹ میں چِھپا ہُوا ہے کیا
نہیں پتا
کمالِ رنگ و مُوقلم
کہاں سے دے گا راستہ۔

☆

ترکہ

بول ارضِ طلب!
بیج اُمّید کا
پھُوٹتا ہے کہاں
اِس جگہ کو تمنّا بنا لُوں گی مَیں
سر پھرے زر کو، سرکش ہَوا کو، فضا کو
منا لُوں گی مَیں
کِشتِ جاں بوؤں گی
چشم سے آب، اور دِل سے کرنیں
دُعاؤں میں بھر لاؤں گی
ایک اک بیج کو
اشک و آہِ شبانہ سے سینچوں گی مَیں
اپنے بچّوں کو سونپوں گی مَیں لہلہاتی ہُوئی کھیتیاں
بول ارضِ طلب!

-☆-

مُشترکہ مفاد

ارضِ تشکیک کے
ذرّہَ بے نمُو
تیری آغوش میں
میری اُمّید ہے
اس کو آزاد کر
پھُولنے دے اسے
پھل اُترنے لگے گا
تو تیری بھی قِسمت بدل جائے گی

-☆-

جنگل

شیر کی اپنی خُدائی
رِیچھ کے اپنے ضوابط
بھیڑیے کا اپنا ہی قانون
اُن پر
حرف گیری کا کِسی کو حق نہیں
مچھّروں کو حُکم ہے
وہ اپنی بھیں بھیں سے غرض رکھّا کریں

-☆-

مُنصِف کی کُرسی خالی ہے

کچی عُمر کی ست رنگی دُنیا میں دِل نے
خوابوں کا اِک محل بنایا
اُس نے محل کے دروازے پر
اِک ایسی زنجیر لگائی
جس کو خُود ہی روز ہِلاتا
مُنصف کی کُرسی پر بیٹھ کے
خُود ہی مُلزم بن کر آتا
اپنی آپ وکالت کر کے
اپنی آزادی کے پروانے پر اپنی مُہر لگاتا
ہنستے کھیلتے
اپنے آپ سے باہر آتا
خُود کو خُود ہی گلے لگاتا
کچی عُمر کی ست رنگی دُنیا میں دِل کو
اپنی ذات کی آزادی کا کھیل بہت اچھا لگتا تھا

اب بھی اکثر بے دھیانی میں
دِل زنجیر ہِلا دیتا ہے
خواب محل کے دالانوں میں

سارا گذرا وقت کھچا کھچ بھر جاتا ہے
ہر سُو ، گریہ وزاری کرتے
زنجیروں میں جکڑے مُلزم
نامعلُوم جرائم کی پاداش میں لائے جانے والے
نامحسوس تشدّد کی چکّی میں پِستے
سینہ کوبی کرتے مُلزم
سب کے پاس مِرا چہرہ ہے
ہر چہرے پر خُون اُگلتی آنکھیں میری
کٹے پھٹے لب بھی میرے ہیں
ہر سینے پر الزامات کی اِک لمبی فہرست سجی ہے
اپنی آپ وکالت کرنا اب اِتنا آسان نہیں ہے
اپنی آزادی کے پروانے پر
مُہر لگانے والے ہاتھوں میں زنجیر پڑی ہے
مُنصِف کی کُرسی خالی ہے

☆

رات

رات کتنی ساحر ہے
گرد سے اَٹے چہرے
بڑھ کے تھام لیتی ہے
اپنے نرم ہاتھوں میں

دِن کا شور کانوں سے
پھیکے منظر آنکھوں سے
چُن کے پھینک دیتی ہے
بے کراں اندھیروں میں

مُضمحل ، تھکے ماندے
لڑکھڑاتے جِسموں کو
بڑھ کے تھام لیتی ہے
رات اپنی بانہوں میں

رات کتنی ماہر ہے
جبر اور مُشقّت کی

سختیاں بھُلانے میں
دوستی نبھانے میں

بے سکُون ذِہنوں کو
لوریاں سُنانے میں
جاگنے ، سُلانے میں
رات کِتنی ماہر ہے

رات کا فسُوں اُس کی
ہر اَدا سے ظاہِر ہے
ہر بیاں سے باہِر ہے
رات کِتنی ساحِر ہے

رات کِتنی بے حِس ہے
اُس کی آستینوں میں
کتنے سانپ پلتے ہیں
تا سَحَر گُناہوں کے
کیسے دور چلتے ہیں
رات جیسے گُونگی ہے
دیکھتی ہے سارا کُچھ
اور کُچھ نہیں کہتی

رات جیسے بہری ہے
سِسکیاں نہیں سُنتی

حوصلہ نہیں دیتی
جِن کی کشتیوں کو غم
ضبط کے جزیرے پر
ٹھیرنے نہیں دیتا
جن کو بارِ بدبختی
زِیست کے سمُندر میں
تیرنے نہیں دیتا
ریگِ ساحلِ شب پر
کیسے سر پٹختے ہیں
رات جیسے اَندھی ہے
آسرا نہیں دیتی
دوست ہی نہیں بنتی
رات کِتنی بے حِس ہے

☆

عِبرت

جانے کِس کی مسخری پہ ہنس پڑی تھی کائنات
اِس قدر بُلند تھا زِندگی کا قہقہہ
کہ وادیِ وُجود گُونجنے لگی
بازگشت
تھرتھرا رہی ہے میری نبض میں

-☆-

مشورہ

ہرنی!
شیر بہُت بھُوکا ہے
آج تُو اپنی بھُوک سرہانے رکھ کر سو جا
باہر مت جا
ہرنی! شیر بہُت بھُوکا ہے

☆

گُفتار کے غازی

ہر جانب پَر کَترے توتے
چُوری کے چکّر میں گُم ہیں
اپنے اپنے پِنجروں میں، گردن اکڑائے
چھن چھن کرتے گھُوم رہے ہیں
دُنیا کو اُلجھا رکھا ہے
اپنی لا حاصل ٹَیں ٹَیں میں

-☆-

اسلم کمال صاحب کے کمالِ رنگ و مُوقلم کے نام

وُہ مٹّی جِس پہ سُورج اپنی پُوری تاب سے چمکے
تو اُس کی تہ میں سوئے سبز موسم جاگ اُٹھتے ہیں
ہری پوشاک شادابی کے کومل گیت لکھتی ہے
جنھیں تن گُنگُناتا ہے
وُہ مٹّی یُوں دمکتی ہے
کہ رنگ و مُوقلم کِرنوں کی صُورت جِھلملاتے ہیں
اشاروں اور بہاروں کی زُباں میں بات کرتے ہیں

مُقفّل خُشک ہونٹوں پر
کسی ضوریز لمحے کا سُنہرا پھُول کِھلتا ہے
تو حرف و صوت کی چٹخی ہُوئی دھرتی پہ پہلی بُوند پڑتی ہے
صدا کا ابر پارہ جُھوم کر آکاش چھُو لیتا ہے
اور خُوشبُو برستی ہے

تمنّا کی ہری بیلیں خیالوں کے ستُونوں سے لپٹتی ہیں
نئے پتّے نئی سرگوشیاں کرتے ہیں آپس میں

تو آنکھوں میں نئے موسم کا پہلا خواب اُترتا ہے
کسی اَن دیکھے، اَن جانے نگر میں رُت بدلتی ہے
پسِ جاں گہری تارِیکی میں اِک تارا چمکتا ہے
مچلتی رات ڈھلتی ہے
سَحَر کا لمس مٹّی کی تہوں میں جگمگاتا ہے

-☆-

واردات

لہُو کی دھار
میری کنپٹی سے گال پر اُتری
مرے شانوں پہ بِکھری
پیرہن پر پھُول بُوٹے کاڑھتی
چکنے ملائم فرش پر دھیرے سے چلتی
چمکتے سیاہ بُوٹوں تک گئی ہے

☆

میرا جی چاہتا ہے

تمھارے ریشمی بِستر سے اُتروں
مجھے اِتنی زمیں دے دو جہاں میں پاؤں رکھ لُوں
ذرا سا آسماں، جِس سے مَیں اپنے سر کو ڈھک لُوں
فراغت کا کوئی لمحہ، کہ جِس میں
مَیں اپنے دِل کی بِکھری خواہشیں آنگن سے چُن کر
تمھارے دِل کی الماری میں رکھّوں
تمھاری خاکِ پا میں گُم ہُوئے خوابوں کو ڈُھونڈوں
اور اپنے مُشک بُو تکیے میں بھر لُوں
تمھارے پاؤں سے لپٹی ہُوئی نظروں کو کھولوں
ذرا سا سر اُٹھا کر آسماں کا رنگ دیکھوں
تمھارے پیار کی نیلی فضا میں زِندگی بھر
پرندے کی طرح مَیں اُڑتی جاؤں
مرا دِل تو بہت کُچھ چاہتا ہے
مگر اِس دِل کا کیا ہے

☆

رخنوں میں سانسیں رکھی ہیں

جِس نے بچپن سے ہر دوڑ میں
دِیواریں ہی جیتی ہوں
اپنے دِل کے سارے دُکھ سُکھ
دِیواروں سے بانٹے ہوں
جِس کی آنکھیں جلتی دِیواروں سے ٹھنڈک پاتی ہوں
دِیواریں جِس کو بانہوں میں لے کر نغمے گاتی ہوں
جب وُہ روئے
اُس کے آنسو دِیواروں پر روشن ہوں
ہنسنا چاہے تو دِیواریں اُس سے پہلے ہنستی ہوں
جِس کے خواب چراغ ہمیشہ
دِیواروں پر جلتے ہوں
جِس کے رُوپ گُلاب ہمیشہ
دِیواروں پر مہکے ہوں
جِس کے تن من کی سب چوٹیں
دِیواریں سہہ جاتی ہوں
جو اُس کو کہنا نہیں آتا، دِیواریں کہہ جاتی ہوں
وُہ اِن دیواروں کو کیسے پار کرے گی، توڑے گی
آسانی سے کب وُہ ایسا جیون ساتھی چھوڑے گی

تیرے نعرے سُن کر اُس کے دِل میں میخیں گڑتی ہیں
دِیواروں پر پڑتی ضربیں
اُس کے دِل پر پڑتی ہیں
رخنوں میں رکھّی سانسوں کو باہر کیسے لائے گی
جِن کے ساتھ وُہ جیتی آئی
اُن کے بِن مر جائے گی۔

☆

مؤذّن نِیند میں گُم ہیں

کوئی آواز ننگے سر مِری گلیوں میں پھِرتی ہے
مِرے گھر کے مُقفّل در، دریچوں کو
بڑی نرمی سے آ کر کھٹکھٹاتی ہے
کِسی روزن پہ لب رکھ کر
تذبذب سے بھری آواز میں دھیرے سے کہتی ہے
"مجھے چادر نہیں مِلتی"

وُہ کہتی ہے
یہ چاروں سمت لفظوں کی مِلیں کِس کام کی ہیں جو
ٹکا ٹک ٹک
فضاؤں کو کھُرچتی ہیں
مِری چُنری نہیں بُنتیں
وُہ کہتی ہے
تُم اپنے ریشمی لہجے سے اِک دھجّی مجھے دے دو

کہ میرے خانوادے میں
برہنہ سر بھٹکنے سے بڑی ذِلّت نہیں کوئی

مُقفّل در کے نیچے سے
کُچھ ایسے حرف سرکا دو
جنھیں مَیں کات لُوں، بُن لُوں

کِسی روزن سے پکڑا دو
سِتارہ سا کوئی مصرع
مَیں جِس کی روشنی اوڑھوں
وُہ کہتی ہے
کہ دروازے کی جِن درزوں میں اپنے سانس رکھتی ہو
وَہیں سے گر تھما پاؤ
اُجالوں کی تمنّا سے دمکتی نظم کا ٹکڑا
جسے آنچل بنا لُوں مَیں
تو مَیں تُم کو دُعا دُوں گی
کہ میرے خانوادے میں
برہنہ سر بھٹکنے سے بڑی ذِلّت نہیں کوئی

☆

درزوں سے آتی روشنی

سُن رکھوالے!
باڑے کے اندر اِک کھڑکی کُھلی ہُوئی تھی
تیری بھیڑ نے باہر جھانکنا سیکھ لِیا ہے

اب ہے اس کے پاس ترازُو
جِس میں تُجھ کو تول رہی ہے

اس کے پاس سماعت ہے اب
جو اِس کائنات میں پھیلی
ہر سرگوشی سُن سکتی ہے

اس کے پاس وُہ نظریں بھی ہیں
جِن کی دھار سے کاٹ دِیے ہیں
اس نے اپنی آنکھ کے بندھن

اب یہ آنکھیں
دروازے کے باہر سب کُچھ دیکھ رہی ہیں

یہ اپنے قدموں پر سیدھا چل سکتی ہے
اِس کے بازُو بھی اب بوجھ اُٹھا سکتے ہیں
اب یہ اپنی راہ کے پتّھر چُن سکتی ہے
اب تو لگتا ہے یہ پھُول اُگا سکتی ہے
دُنیا کو مہکا سکتی ہے

☆

اِک بے دھیانی

مَیں ٹھنڈے توے کی روٹی ہُوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
مِرے کتنے ٹکڑے اُکھڑ گئے
مَیں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
مَیں کِسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پِسنا، گُندھنا اور جلنا
بے کار گیا، مَیں ہار گئی
اِک بے دھیانی مجھے مار گئی

☆

تمھارے لب پہ تھی مَیں بھی

یہ آنکھیں مہرباں تھیں
ہم نفَس ، ہم درد، اپنی تھیں
مگراب اِن سے کوئی اجنبی سی آنچ آتی ہے
مجھے یہ تو نہیں معلُوم، کیسے آگ بھڑکی ہے
جلا کیا ہے؟
بچا کیا ہے؟
مگر اِتنا تو بتلا دو
تمھارے راکھ داں میں اَدھ پیے سگریٹ ہیں یا مَیں ہُوں؟

-☆-

دُودھ کا جلا

اِک آہٹ سی
دستک بن کر
مِرے دِل کش، رنگ بھرے خوابوں کی تال بنی
پھر سُر میں ڈھلی
اِک گیت لہُو میں پھیل گیا
مَیں اُس کو پینگھ بنا لیتی
مَیں قوسِ قُزح کو چُھو آتی
پر گیت کا سُر ہی ٹُوٹ گیا
اور سپنا سارا جُھوٹ ہُوا
اب پہر ڈھلے
شب گلیوں میں جب گُھومتی ہے
جب آہٹ دستک بنتی ہے
مَیں سوچتی ہُوں
ہے کون بھلا!
کوئی ہے بھی سہی؟

-☆-

مجھے اپنا جنازہ خُود اُٹھانا ہے

جنھیں مُجھ سے محبت کا ہے دعویٰ ہے...... آج وُہ سب لوگ
میری قبر تک لا کر مجھے
اب لَوٹنے کو ہیں
مجھے اُن کی محبّت کا بھرم رکھنا ہے
خُود کو لاش میں تبدیل کرنا ہے
جنازہ خُود اُٹھانا ہے
اور اِس کے بعد
خُود کو دفن کرنا ہے
محبّت کو بھی پہلُو میں لٹانا ہے
مِری نظمو!
بس اِک مُٹھّی تُم اپنی رُوح سے بھر کر
مِرے مدفن پہ ڈال آنا
دُعائے خیر کر دینا

-☆-

پانی سے بڑی آگ

اِک جنگل جلتا ہے مُجھ میں
جِس کے ہر پیڑ کو فِطرت نے
اپنے ہاتھوں سے سینچا تھا
ہر پیڑ کی شاخوں پر خوابوں کے غُنچے تھے
ہر غُنچے میں تھا رنگ مہکتی یادوں کا
ہر یاد سُنہری کِرنوں کے ہالے میں تھی
اُس ہالے میں پُورا جنگل آسُودہ تھا
سر سبز، سکُوں آور، خُوشبُو سے بھرا ہُوا
سُکھ کی آغوش میں ہنستے جنگل پر جانے
کِس جانب سے اِک جلتی بلتی رُت آئی
ہر پیڑ پہ شُعلے کِھل اُٹھے
ہر شاخ پہ غُنچے جُھلس گئے
پنچھی کُرلاتے پِھرتے ہیں
یہ آگ بُجھے گی اب کیسے

☆

خاک نہ جانے کب بولے گی

کانٹے کنکر چُنتے چُنتے
ہاتھ ہمارے چھلنی ہو گئے
پھول رِجا کے، حرف دُعا کے
اِس چھلنی سے، گر جاتے ہیں
گر کر مٹی ہو جاتے ہیں
خاک نہ جانے کب بولے گی

-☆-

رفاقت

مَیں اپنے کسان کا پٹکا ہُوں
مجھے گھاٹ کے چِکنے پتّھر پر
وُہ پٹخ پٹخ کر دھوتا ہے
پھر کانٹوں والی جھاڑی پر
پھیلاتا اور سُکھاتا ہے
شانے پر ڈال کے چلتا ہے
مَیں اُس کی ذات کا حِصّہ ہُوں
وُہ اپنے پِنڈے سے اُٹھتی
ہر خُوشبُو مُجھ کو دیتا ہے
میلے ٹھیلے کی خُوشیوں میں
مجھے ساتھ لگائے پِھرتا ہے
جب دِل پر کوئی چوٹ پڑے
تو آنکھ میں چمکے تاروں کو
مِری جھولی میں بھر دیتا ہے
جب دُھوپ کڑکتی ہو سر پر
اور لمبا پینڈا کرنا ہو
وُہ مُجھ کو ڈھال بناتا ہے
مجھے سر ماتھے پر رکھتا ہے

کبھی چِہرے پر پھیلاتا ہے
کبھی سر سے لے کر پیروں تک
مجھے پہروں اوڑھے رکھتا ہے
مَیں اپنے کِسان کا پٹکا ہُوں

☆

پردیسی

اِس بار اکیلے مت آنا
کوئی بات اَدھوری لے آنا
جسے مِل کے پُورا کرنا ہو
کوئی لفظ، جسے تُم کبھی کہیں نہیں بول سکے
کوئی گیت، جسے تنہا نہیں گایا جا سکتا
کوئی رنگ، جو مَیں نے ساری عُمر نہیں دیکھا
اِک بیگ میں بھر کر لے آنا

جو خواب پرائے دیس میں تُم نہیں دیکھ سکے
وُہ پھُول
جو تُم نے کِسی کو دینا چاہے اور نہیں دے پائے
وُہ نیند
جسے گٹھڑی کی طرح
پلکوں پر لادے پھِرتے ہو
سب اپنے ساتھ اُٹھا لانا
اِس بار اکیلے مت آنا

☆

غم گُسار

دُھوپ میں ساتھ کھڑے ہونے والوں کی خُوشبُو
دِل کے اندر رچ جاتی ہے
خُون کا حصّہ بن جاتی ہے

☆

برزخ میں جنّت کی کِھڑکی

تُم آتے ہو تو چلتی ہیں ہوَائیں اور ہی رُخ پر
سُنہری دُھوپ دِیواروں پہ آ کر جگمگاتی ہے
سِتارے رات کو اٹھکیلیاں کرتے ہیں آنگن میں
گلے مِلتی ہیں اِک اِک شَے سے شب بھر چاند کی کِرنیں
دِل و جاں میں اُجالا ہی اُجالا پھیل جاتا ہے

تمھاری نیم وَا آنکھوں میں چاہت مُسکرانے سے
ہوَائیں مُسکراتی ہیں
تمھارے لب پہ کوئی پھُول جیسی بات آنے سے
فضائیں گُنگُناتی ہیں
اور اُن کے گیت کی لَے پر
مِرا دِل ناچ اُٹھتا ہے
یہ ضدّی اور خُود سر بس تمھارے ساتھ ہنستا ہے
تمھارے سانس کی خُوشبُو سے سارا گھر مہکتا ہے

تمھارے لمس کی گرمی مِری ہمّت بندھاتی ہے
مجھے تنہائی سے لڑنے کی طاقت تُم سے مِلتی ہے

خُوشی اِک رنگ بن کر پھیلنے لگتی ہے جب ہر سُو
رگوں میں سنسناتا ہے تمھارے قُرب کا جادُو
ہمارے آشیانے کو محبت گھیر لیتی ہے

تمھارے لوٹ جانے سے
وُہی پھیکے شبانہ روز معمولات ہوتے ہیں
وُہی تنہائیاں اپنی، وُہی حالات ہوتے ہیں
بہُت سہمے ہُوئے، چُپ چاپ سے دِن رات ہوتے ہیں۔

-☆-

آئینہ

یہ چہرہ لے کے تُم کیسے مجھے ملنے چلے آئے
یہی سر ہے
خیانت کا جہاں سودا سمایا تھا
یہ پیشانی، جہاں اِک سانپ پھن پھیلائے بیٹھا ہے
مِری تقدیر کو ڈس ڈس کے نیلا کر دِیا جِس نے
مِری معصُوم چاہت سے زنا کرتی ہُوئی آنکھیں
وفا کو نوچتی نظریں
یہ عارض، جِن پہ سجتی ہی نہیں تھی جُھوٹ کی سُرخی
یہی اب کِس طرح کِذب و ریا سے تمتماتے ہیں
یہ وحشی ہونٹ جو میرے سکُوں پر ٹُوٹ پڑتے ہیں
اِنھی کی سنگ باری سے مِری نازُک بدن خُوشیاں
لہُو ہوتی رہیں اب تک
یہ خائن ہاتھ، جِن کا لمس تُم نے بیچ ڈالا ہے
برائے مہربانی اِن سے چہرہ ڈھانپ لو اپنا
سُنو...... جاتے ہُوئے دروازۂ دِل بند کر جانا

-☆-

شہر کا موسم کیسے بدلا

ہرے بھرے آنگن میں چھم چھم کرتی گوری
اب پنجوں کے بل چلتی ہے
چمکیلے خوابوں نے اُس کے پاؤں میں جو پازیب سجائی
چلتے چلتے ٹُوٹ گئی ہے
نیلے جوڑے کا رُوپہلا گوٹا تِلّا ماند ہُوا ہے
منہدی کی رنگت بدلی ہے
بُجھی ہُوئی ہیں آنکھوں کی لَو دیتی شمعیں
چہرے پر سرسوں پھولی ہے
رہ داری کی سُرخ ملائم مخمل جل کر راکھ ہُوئی ہے
دِیواروں کے اُوپر پھیلی
بیلوں کے سب سُرخ گُلابی پھول اُڑا کر لے گئی آندھی
آنگن میں پیلے پتّوں کی جھڑی لگی ہے
پیلی بارش
چھن چھن کرتی سارے گھر میں ناچ رہی ہے
دِل سے اُٹھتے درد کی خوشبُو اُڑتی جائے
روشن دان سے چھن کر آتی آہ نے اپنے پر پھیلائے
کِھڑکی پر لہراتی سِسکی گھر سے باہر جھانک رہی ہے
سارے شہر کی نیند اُڑی ہے

☆

مِرا خواب گھر

المدد!...... المدد!

کوئی سیلاب ہے

میرے گھر کو بہائے لیے جا رہا، کوئی سیلاب ہے

ناگنوں کی طرح شُوکتی تُند لہریں

ستُونوں سے لپٹی ہُوئی سبز بیلوں کے ٹکڑے اُڑاتی

مِری خواب گہ میں گھسی آ رہی ہیں

گُلابی، مہکتا ہُوا، نرم بِستر

ہے ننّھی سی ناو

جو بپھرے سمُندر میں زیر و زبر ہے

جسے یُوں اُٹھا کر پٹختی ہیں موجیں

کہ جیسے ابھی توڑ کر پھینک دیں گی

مِرا خواب گھر

نذرِ سیلاب ہوتا چلا جا رہا ہے

مدد! نُوحؑ کے رب

مدد! آبِ زم زم کے مالک

مدد! میرے رب

اور...... طُوفاں کے خالق

-☆-

لڑکیاں اور تِتلیاں

ایک سی پرواز
ایک سے انداز
ایک جیسا حُسن
ایک جیسا ناز

حُسن اور ناز کی
رنگ اور پرواز کی
ایک جِتنی عُمر
لڑکیاں ہیں تِتلیاں

☆

آمریّت

تمھیں مَیں دیکھتی ہُوں، دیکھتے رہنے کی خواہش سے
مگر تُم دیکھتے ہی دیکھتے کُچھ یُوں بدلتے ہو
کہ وُہ لب ہی نہیں رہتے
جو دِل کو زیر کرتے ہیں
نہ وُہ آنکھیں
جو سچّائی کا روشن دان ہوتی ہیں
نہ وُہ ضوریز پیشانی
جسے چُھونے کو جی چاہے
نظر پھر بھی نہیں ہٹتی
یقیں آتا نہیں ہے دِل کو آنکھوں کی گواہی پر
محبت کرنے والوں میں یہی اِک نقص ہوتا ہے
کہ دِل کی آمریّت میں
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں

☆

طلب سے تڑپ تک

اندھیری رات کے بے چین سینے سے دُعا نِکلی
کہیں ٹکتی نہیں ہے
ہَوا میں اُڑ رہی ہے
فضا میں تیرتی ہے
گلوں سے کھیلتی، خاکِ چمن کو رولتی ہے
سُلگتے ریگزاروں کی جُھلستی ریت میں کُچھ ڈُھونڈتی ہے
سِتاروں کو پھٹکتی ہے، زمیں کو چھانتی ہے
سمُندر کی تہوں میں جھانکتی ہے
بھٹکتی پِھر رہی ہے
نجانے کب اِسے منزل ملے گی
کوئی در اِس کی آمد پر کُھلے گا
ضیا پھیلے گی ہر سُو

-☆-

ٹراما

مَیں نے سُوجی ہُوئی بند آنکھوں کو دِھیرے سے کھولا تو ہے
پر کوئی بھی نظارہ شناسا نہیں
جلتے ماتھے پہ اِک ہاتھ ٹھہرا تو ہے
لمس نے کیا کہا ہے، مَیں سمجھی نہیں
بھُوک شِدّت کی ہے
پیاس کی حد نہیں
پر یہ کھانے پہ اِصرار کرتے ہُوئے اجنبی کون ہیں؟
پانی کڑوا سا ہے
دُودھ بے ذائقہ
ایک لُقمے میں بھی
میری ماما کے ہاتھوں کی خُوشبُو نہیں
پھِر دوائی پِلانے کوئی آ گیا
میرے پاپا کی بانہیں کہاں کھو گئیں
درد ہے جسم میں
اِتنے چہرے ہیں، پر
میری ٹیچر شبانہ، سہیلی علینہ کہاں رہ گئیں
مجھ سے شاید شرارت کوئی ہو گئی
جس کی پاداش میں
مجھ کو پریاں اُٹھا کر چلی آئی ہیں اجنبی دیس میں

میرے اللہ! اب
دے مُعافی مجھے
میری دُنیا میں واپس مجھے بھیج دے
اچھی بچّی مَیں بن کے رہوں گی سدا
پکّا وعدہ مِرا

☆

(زلزلہ، 8 اکتوبر 2005ء)

خیمۂ محبت

محبت کا خیمہ اُٹھا کر چلے ہیں
یہ جذبوں کی روٹی
یہ آنکھوں کا پانی
یہ اِحساس کی گرم چادر
اُخوّت کا کمبل اُٹھائے
لرزتے پہاڑوں کی جانب چلے ہیں

زمیں کی دراڑوں میں میرا بدن خُوں میں ڈوبا پڑا ہے
شکستہ مکانوں کے ملبے تلے میرے بازُو دبے ہیں
مِرے پھُول کلیاں
مِری چہچہاتی ہُوئی شوخ چِڑیاں
مِرے قرۃُالعین، لختِ جگر
موت کے سرد ہاتھوں میں ہیں
اور یہ اُن کو چُھڑانے چلے ہیں

مِرے سب حُروفِ دُعا اُن کے ہمراہ
چاہت کی شمع جلا کر چلے ہیں
محبت کا خیمہ اُٹھا کر چلے ہیں

-☆-

(زلزلہ 8 اکتوبر 2005ء)

گُم شُدہ صبح

چُوم کر چاند جیسی پیشانی
مُنہ اَندھیرے اُسے جگایا تھا
نیند کا نشّا توڑنے کے لیے
ٹھنڈے پانی سے مُنہ دُھلایا تھا
ناشتے پر بلائیں لے لے کر
لُقمے لُقمے پہ لاڈ اُٹھایا تھا
ریشمی بال خُود سنوارے تھے
اور بستہ اُسے تھمایا تھا
کھلکھلاتے ہُوئے، چہکتے ہُوئے
ہاتھ اُس نے مجھے ہلایا تھا
جانے پھر کیا ہُوا تھا، یاد نہیں
دِن نکلتا ہے، ڈُوب جاتا ہے
اور وُہ لوٹ کر نہیں آتا

(زلزلہ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

☆

حوّا

چاند کی پسلیوں سے نمُودار ہوتی ہُوئی چاندنی
دُور تک پھیلتی
رات پر چھا گئی
چاند تنہا رہا
اور اپنی دُعاؤں پہ ہنستا رہا

-☆-

اِن ڈور پلانٹ

مجھے سب نے بتایا ہے
کہ مَیں اِن ڈور پودا ہُوں
مگر اِس حبس میں کُچھ تو ہَوا درکار ہے سائیں
کہ پودا باغ میں ہو یا کسی گملے کے پنجرے میں
اُسے بھی سانس لینا ہے

مِرے سائیں! ضرُوری ہے بہُت دو گھُونٹ پانی بھی
جڑیں پیاسی ہوں تو شاخوں پہ ہریالی نہیں رہتی
نئی کونپل نہیں آتی
دمکتے سبز پتّے زرد پڑ کر سُوکھ جاتے ہیں

سُنا ہے روشنی بھی لازمی عُنصُر ہے جینے کا
اندھیرے کا تسلسُل زِندگی کو چاٹ جاتا ہے
مجھے بھی زِندہ رہنے کو ضیا درکار ہے سائیں
ہَوا درکار ہے سائیں

-☆-

ٹھنڈی مٹّی

کچی پکّی ہانڈی جیسی
ذائقہ، خُوشبُو، رنگ نہ لذّت
کون سجائے دسترِخوان پہ
کون سراہے
کہا تھا تُجھ کو
آگ بِنا نہیں بات بنے گی
کُچھ من جلتا
کُچھ تن تپتا
رگ رگ اندر بھانبھڑ مچتا
نظروں سے چنگاری اُڑتی
سینے میں انگار دہکتے
خُون اُبلتا
بھاپ اُڑاتا
کھدر کھدر کُچھ گیت سُناتا
پِھر شاید کُچھ رنگ نکلتا
ذائقہ بنتا
خُوشبُو اُڑتی
لیکن...... تیری ٹھنڈی منطق

-☆-

زادِ سفر

بہُت سا زادِ سفر ماں نے میرے ساتھ کِیا
مِری زُبان تھی اُس میں ، نہ ہی مِری گُڑیا

ہر ایک موڑ پہ حیرت کا سامنا تھا مجھے
کہ رُوبرُو تھی مِرے اور ہی کوئی دُنیا

مِری کتابیں مِرا ساتھ دے نہیں پائیں
کِسی بھی کام نہ آیا مِرا پڑھا لکھّا

مِری گواہی میں نظمیں مِری کھڑی تو ہُوئیں
مگر وہاں تو کوئی شور تھا قیامت کا

مِری صفائی سے کترا گیا وکیل مِرا
قدم قدم پہ سزا تھی ، خطا کا عِلم نہ تھا

وُہ دُھوپ تھی کہ شجر بھی نہ دے سکا سایہ
مِرے ثمر مِرے ضامن بنے تو چین آیا

-☆-

عُجلت گزیدہ

کُچھ ایسا جادُو کیے دے رہی تھی شہنائی
حواس میں تھی مری ماں ، نہ ہوش میں بھائی

مجھے روانہ کِیا سب نے اِتنی جلدی میں
نہ دِن کا چین سمیٹا ، نہ نیند رکھ پائی

وَہیں کہیں مِرے ساماں سے گِر گیا بچپن
مَیں کھلکھلاتی ہنسی بھی وَہیں پہ بھُول آئی

کِسی کا ناز ، کِسی کی اَدا تھی پاس مِرے
سہیلیوں کو کوئی چیز بھی نہ لوٹائی

مِرے سرہانے پڑے رہ گئے خیال مِرے
جو خواب سینت کے رکھّے تھے ، وُہ بھی کب لائی

کہانیوں کی پری نے بھی پھیر لیں آنکھیں
چھڑی گُھمائی کِسی نے ، نہ کی مسیحائی

نجانے مٹّھی میں کِس نے تھما دِیے آنسُو
نجانے جلدی میں کِس کا نصیب اُٹھا لائی

اِن عُجلتوں کا نتیجہ نجانے کیا نکلے
نجانے کِس طرح ہو گی مِری پذیرائی

-☆-

طلاق

خُدا کی مجازی خُدا پر نوازش
خُدائی کا تُحفہ
شریکِ سفر کو
غُبارِ سفر کی طرح جھاڑنے کی اجازت

☆

طلاقِ رجعی

محبّت بھرا دِل زمیں پر ، گرانا
اُسے ایک ٹھوکر لگا کر اُڑانا
دوبارہ زمیں تک پہنچنے سے پہلے
بِکھرنے سے پہلے
بڑی ہی مہارت سے پِھر تھام لینا
مُسلّم ہے کھیل اور کھلاڑی کی عظمت
خُدائی کی لذّت

-☆-

مُطلقہ رجعیہ

تمھیں ہم رِہائی نہ دیں گے ابھی
اور نہ جُرمانہ لیں گے
تمھاری سزا سوچنے کے لیے اِس عدالت کو کُچھ وقت درکار ہے
تُم خموشی سے یُوں ہی کٹہرے میں روزانہ آتی رہو
اور چُپ چاپ اِلزام سُنتی رہو
وقت آنے پہ ہو جائے گا فیصلہ
کون سا در کُھلے گا تمھارے لیے
قیدِ تنہائی کا، یا رِہائی کا، رُسوائی کا، موت کا
یا کِسی دِل کا، چاہت کے پھُولوں سے مہکے گُلستان کا

☆

ڈِسپوزایبل

تُم سے جِتنا کام لے سکتے تھے، وُہ ہم لے چکے
ایسی چیزیں سینت کر رکھنے کا اب فیشن نہیں
آنے والے وقت میں جِن کا کوئی مصرف نہ ہو
تُم نے میری نسل کو آگے چلایا...... شکریہ!
میری راتوں کو بہُت رنگیں بنایا...... شکریہ!

-☆-

قدرِ مُشترک

خُدا اور مجازی خُدا میں کوئی قدر ایسی بھی ہے؟
جِس کو ہم مُشترک کہہ سکیں
ایک کی ذات سے ظُلم ممکن نہیں
دُوسرے کو خُدائی کا اِتنا نشا ہے کہ اِس کے لیے
قہر آسان، اِنصاف دُشوار ہے

☆

تین سالہ بچّی کا ریپ

دِل کرتا ہے اُس وحشی کے
سینے میں اِک خنجر ماروں
ناخُن کھینچوں......
ہاتھوں اور پیروں کی اِک اِک اُنگلی توڑوں
ہَوَس کی ماری آنکھیں نوچوں اور کُتّوں کے آگے ڈالوں
ہڈیاں توڑ کے سُرمہ کر دُوں

سینہ چیروں
دِل کو ٹھوکریں مار مار کے قیمہ کر دُوں
میرے بس میں ہوتا تو مَیں
اُس وحشی کے سارے جسم پہ
بال بال کی جڑ میں سُوئیاں گاڑ کے زِندہ دفن کراتی
کیوں کہ ایسے حیوانوں کو
عدمِ ثبُوت کا فائدہ دے کر
اکثر چھوڑ دِیا جاتا ہے

☆

گِلۂ وفائے جفا نُما

ہمارے چشم و ابرُو پر دو عالم وار دے کوئی
ہمارے اِک اشارے کے لیے جاں ہار دے کوئی
ہماری خاکِ پا پر کہکشاں قُربان ہے لیکن
ہمیں مانا نہیں جاتا

ہمارے دم سے سنگ و خشت کو رُتبہ ملے گھر کا
ہماری ذات سے وابستہ ہے سُکھ زِندگی بھر کا
ہمارے دم سے ہر رِشتہ ہُوا ہے مُعتبر لیکن
ہمیں مانا نہیں جاتا

کِسی کے پاس اِتنا سوچنے کا وقت ہی کب ہے
کہ جنّت کی ہَوائیں آ رہی ہیں کِس دریچے سے
ہماری ذات سُکھ کا اِستعارہ ہے مگر پِھر بھی
ہمیں مانا نہیں جاتا

ہمارا دامن و دستِ دُعا ہر پل کُشادہ ہے
کبھی بھائی، کبھی شوہر، کبھی فرزند کی خاطر
ہمارے خُون سے ہر رہ گذر کو سُرخ کر کے بھی
ہمیں مانا نہیں جاتا

ہمارے دم سے یہ ہنگامۂ امروز و فردا ہے
ہماری گود کے پھُولوں سے یہ گلشن مہکتا ہے
ہمارا خُون کائنات کے دِل میں دھڑکتا ہے
ہمیں مانا نہیں جاتا

ہم اپنے دِل کے دروازوں پہ اِستادہ ہیں صدیوں سے
کوئی آہٹ، کوئی جھونکا ہماری رُوح میں اُترے
ہمارا نام لے کوئی، ہمیں پہچان لے کوئی
ہمیں بھی مان لے کوئی

-☆-

رہبر

مجھے معلوم ہے
غیر کے ہاتھ میں تیری زنجیر ہے
میرے گھر کی نگہ داری اب تیرے رُتبے سے کم بات ہے
تیری گردش کا محور وہی ہاتھ ہے
جس میں تیرے لیے
زہر آلود ٹکڑے کی سوغات ہے

☆

بھُلکّڑ

قِسمت !......تُو مجھے کہاں رکھ کے بھُول گئی ؟
میلے کپڑوں کی گٹھڑی میں
برتنوں کی الماری میں
قد سے اُونچی شیلف پر
مُقفّل دراز میں
یا پھر کِسی دِل کے دُور دراز گوشے میں

قِسمت ! کُچھ یاد کر
تُو نے مجھے کہاں ڈالا تھا
اچار کے مرتبان میں
مرچوں کے ڈبّے میں
ماچس کی ڈِبیا میں......یا کِسی کے سگریٹ کیس میں
قِسمت !یاد کر
تُو نے مجھے پھینک تو نہیں دِیا تھا؟
چُولھے کی راکھ میں
یا پھر......کِسی کے پیروں کی خاک میں

-☆-

فالتو پُرزوں والی گاڑی کون چلائے؟

میرے خالق!
مجھے عورت کیوں بنایا؟
عورت بنانا اگر بہُت ضرُوری تھا
تو بدن بنا دینا کافی تھا
سینے میں دِل کیوں رکھ دِیا
دِل میں اِحساس کیوں رکھ دِیا

عورت ہی بنانا تھا
تو زُلفوں سے سجا ہُوا سر بنا دیتا
سر میں دماغ کیوں رکھ دِیا
دماغ میں سوچ کیوں رکھ دِی
یہاں تو خُوب صُورت چشم وابرُو سے کام چلنا تھا
تُو نے آنکھوں میں گہرائیاں اور گہرائیوں میں اشک کیوں رکھّے
سچ اور جُھوٹ کی پہچان کیوں بخش دِی
غُنچہ دہن بنا دیتا
دہن میں زُبان اور زُبان میں قُوّتِ گویائی کیوں رکھ دِی

☆

آنکھ مچولی

کبھی تُم محبت کا ہفت رنگ آسماں بن کر
میری زمین پر تن جاتے ہو
کبھی تُم سُلگتا سُورج بن کر
دُھوپ کے تیر برساتے ہو
کبھی تُم مہربان بادلوں کی طرح
مجھے شرابُور کر دیتے ہو
اور مَیں لہلہا اُٹھتی ہُوں
کبھی تُم خُشک لہجوں کے پتّھر
مجھ پہ یُوں برساتے ہو کہ مَیں چٹخنے لگتی ہُوں
کبھی تُم میرے پیروں تلے پھُول بِچھا دیتے ہو
اور کبھی کانٹوں پر گھسیٹتے ہو
کبھی مَیں تمھیں پا لیتی ہُوں
کبھی تُم مجھے کھو دیتے ہو

☆

مجھے ورثہ نہیں مِلا

میری ماں کو تالے لگانے کی عادت نہیں تھی
اُس کے ٹرنک بھی کُھلے رہتے تھے، الماریاں بھی
اُسے محبت بھی وافر مِلی تھی، توقیر بھی
اُسے سہیلیاں بنانے کی بھی اِجازت تھی اور ہنسنے کی بھی
وُہ غم بانٹ لینے میں بھی آزاد تھی اور خُوشیاں تقسیم کرنے میں بھی
اُسے بہُت سراہا جاتا تھا اور چاہا بھی
اُسے وقار بھی دِیا گیا تھا، اِختیار بھی
اُسے تالے لگانے کی نہ عادت تھی، نہ ضرُورت
اُس کا ہاتھ بھی کُھلا تھا اور دِل بھی

اُس کی بیٹی ہر روز تالے خریدتی ہے
جگہ جگہ لگاتی ہے
اُس کے پاس سینتنے اور چھپانے کو بہُت کُچھ ہے
شادِی کے اگلے ہی روز
اُس نے اپنے پِندار کی کِرچیاں سمیٹ کر دراز میں رکھیں

عِزّتِ نَفس کے ٹکڑے الماری میں چھپائے
اپنے وقار کی اُڑتی دھجّیاں سمیٹ کر ٹرنک میں ڈالیں
ہر جگہ تالا لگانا پڑا

اُسے نہ سہیلیاں بنانے کی اِجازت ہے نہ ہنسنے کی
اُس کے لبوں پر قُفل ضرُوری ہے
وُہ نہ کِسی کا غم بانٹ سکتی ہے نہ خُوشیاں
اُسے نہ وقار دِیا گیا ہے نہ اِختیار
اُس کے ہاتھ بھی بندھے ہُوئے ہیں، پاؤں بھی
کوئی کِسی ٹرنک میں نہ دیکھ لے
کِسی دراز میں نہ جھانک لے
کوئی آنکھوں میں نہ دیکھ لے
کوئی دِل میں نہ جھانک لے
تالے لگانا اُس کی ضرُورت بھی ہے، مجبوری بھی

-☆-

مَیں ایک بار سر اُٹھانا چاہتی ہُوں

میری گردن میں موٹی زنجیر ہے
مجھے مُنہ کے بل گھسیٹا جاتا ہے
گلی گلی
شہر شہر
رِشتہ رِشتہ
شکُوک و شُبہات کی ریت میں
طعنوں کے پتّھروں
اور تُہمت کے کانٹوں پر
میری ناک ٹُوٹ چکی ہے
آنکھوں میں ریت بھری ہے
اور کانوں میں زنجیر کا شور ناچتا ہے
مجھے ایندھن بنا دِیا گیا ہے
مَیں خُود کو جلا کر کھانے تیّار کرتی ہُوں
سبزی کے ساتھ اُنگلیاں بھی کٹتی ہیں، دِل بھی
آٹے میں آنسوؤں کا نمک گوندھ کر
خُود کو توے پر ڈالتی ہُوں
گوشت کے ساتھ بھُونتی ہُوں

نوزائیدہ خواب

اور اپنا آپ

تیز آنچ پر اُبلتا ہے

چھوٹا سا دِل

مجھے سوختہ دیکھ کر

کِس کی آنکھوں میں کیا رنگ اُترتا ہے

سینے پر جُھکے سر کے ساتھ کِس طرح دیکھوں

مَیں اِک بار سر اُٹھانا چاہتی ہُوں

مَیں دیکھنا چاہتی ہُوں

کہ زنجیر کے دُوسرے سرے پر کون ہے

-☆-

ZINDA HOON by **Hameeda Shaheen**

گذشتہ تیس سے پینتیس برسوں میں جدید اردو نظم کے حوالے سے
ایک انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ کلاسیکی غزل کے آرائشی اسلوب اور
بیانیہ نظم کی کڑی بندشوں سے اثر قبول کرنے کی روش اب پرانی بات
ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کی نظم، آزاد فضا میں کروٹیں لے رہی ہے۔
یہ آزادی اصلاً شاعر کے اسلوب اور فکر کی آزادی ہے۔ مانا کہ آج
بھی متعدد نظم گو شعرا، اپنی نظموں میں کلیشے اور پامال لفظیات نیز
اسالیبی توڑ پھوڑ اور مزاحمتی شاعری کے نیم سیاسی نعروں کی زد پر ہیں،
تاہم ایک اچھی خاصی تعداد ایسے نظم گو شعرا کی بھی ہے جو اپنی
شعری ڈکشن کو بین الاقوامی شعری ڈکشن کے قریب تر لے آئے ہیں۔
ساتھ ہی انھوں نے اپنی انفرادیت کا بھرپور مظاہرہ بھی کیا ہے۔
ان نئے نظم نگاروں میں حمیدہ شاہین کی آواز میں جو تیقن اور اسلوب
میں جو تازگی ہے، وہ اس کے علاوہ محض گنتی کے چند نظم نگاروں
ہی کو حاصل ہو سکی ہے۔ حمیدہ شاہین کے ہاں اسلوب کی تازگی اور
پختگی، امیجری کی توانائی اور نیا پن اور موضوعات کو خاک و افلاک کے
وسیع تر منظرنامے سے منسلک کرنے کی روش اس بات پر دال ہے
کہ وہ اس راستے پر گامزن رہی تو آگے چل کر اردو کی ایک بڑی نظم
نگار شاعرہ کی حیثیت سے پہچانی جائے گی۔

وزیر آغا